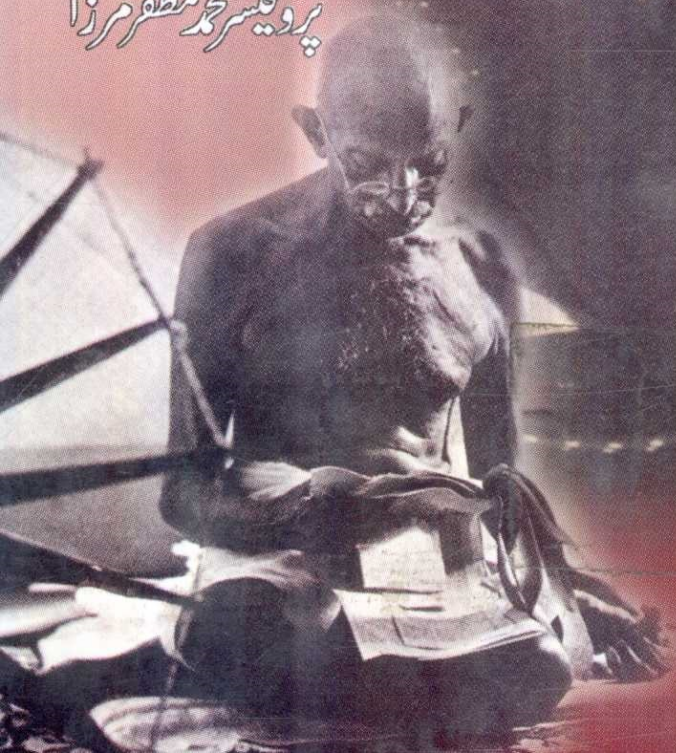


قائد اعظم اور گاندھی

www.KitaboSunnat.com

پروفیسر محمد مظفر مرزا



بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ
قُلْ أَطِيعُوا اللَّهَ
وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ

مَجْلِسُ التَّحْقِیْقِ الْإِسْلَامِیِّ
محدث لائبریری

کتاب وسنت کی روشنی میں صحیح مائے دینی اور دعوائی کتب کا سب سے بڑا مفت مرکز

معزز قارئین توجہ فرمائیں

- کتاب وسنت ڈاٹ کام پر دستیاب تمام الیکٹرانک کتب... عام قاری کے مطالعے کیلئے ہیں۔
- مَجْلِسُ التَّحْقِیْقِ الْإِسْلَامِیِّ کے علمائے کرام کی باقاعدہ تصدیق و اجازت کے بعد (Upload) کی جاتی ہیں۔
- دعوتی مقاصد کیلئے ان کتب کو ڈاؤن لوڈ (Download) کرنے کی اجازت ہے۔

تنبیہ

ان کتب کو تجارتی یا دیگر مادی مقاصد کیلئے استعمال کرنے کی ممانعت ہے
کیونکہ یہ شرعی، اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔

اسلامی تعلیمات پر مشتمل کتب متعلقہ ناشرین سے خرید کر تبلیغ دین کی
کاوشوں میں بھرپور شرکت اختیار کریں

PDF کتب کی ڈاؤن لوڈنگ، آن لائن مطالعہ اور دیگر شکایات کے لیے
درج ذیل ای میل ایڈریس پر رابطہ فرمائیں۔

✉ KitaboSunnat@gmail.com

🌐 www.KitaboSunnat.com

LIBRARY
20836
Punjab University Library

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

www.KitaboSunnat.com

جنگ پلشتہ

DATA ENTERED

قائد اعظمؒ اور گاندھی

ایک سنسنی خیز انکشافاتی اور تجزیاتی مطالعہ اور موازنہ

LIBRARY
20836
Punjab University Library

پروفیسر محمد مظفر مرزا

جنگ پبلشرز

اکیسویں صدی کے تقاضوں سے ہم آہنگ
ہر عمر اور ہر ذوق کے قارئین کے لئے
خوبصورت اور معیاری مطبوعات



ناشر: میر تقی میر
جملہ حقوق محفوظ

اشاعت : جون 1999ء
قیمت : 100 روپے
سرورق : انیس یعقوب
مدیر انچارج : مظفر محمد علی
پبلشر : جنگ پبلشرز لاہور (جنگ انٹر پرائزز
پرائیویٹ لمیٹڈ کا ایک ذیلی ادارہ)
مطبع : جنگ پبلشرز پریس
13 سر آغا خان روڈ لاہور

LIBRARY
208361
Injeb University Library

انتساب

شہیدانِ تحریکِ پاکستان کی شہادتوں آہوں، سسکیوں،
بے چارگیوں اور خون کے ہتے دھاروں کے نام

فہرست مضامین

- | | |
|-----|------------------------------------|
| 1 1 | ۱۔ کون کتنا بڑا تھا؟ |
| 5 3 | ۲۔ کون جیتا کون ہارا؟ |
| 9 3 | ۳۔ شیرِ مسلم لیگ اور روہاہ کانگریس |

20836

حرفِ گزارش.....

ہم نے پاکستان بننے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، میری عمر اس وقت تین چار سال ہوگی ہندو کا تصور نہ ہندو کی پہچان، ہندو کے اخلاق و اقدار کا علم، نہ تحریک پاکستان کا آنکھوں دیکھا حال، اساتذہ کرام نے کچھ پڑھایا، ماں باپ اور برادر بزرگ جناب پروفیسر محمد منور مرزا صاحب سے سیکھا بلکہ انہوں نے زبردستی سکھایا۔ تحریک پاکستان اور حضرت قائد اعظمؒ کی محبت اور عقیدت۔ برادر بزرگ کی وجہ سے دل نشیں بھی ہوئی اور جزوِ جاں بھی بنی — کتابوں کے مطالعے کا شوق، زندگی کا مرغوب مشغلہ کبھی نہیں رہا، پہلے بھی یہی حال تھا اور اب بھی یہی کیفیت ہے۔ البتہ حضرت قائد اعظمؒ سے والمانہ لگاؤ نے تحریک پاکستان اور قائد اعظمؒ پر لکھی گئی کتب کے مطالعے سے ذوق میں الاؤ ضرور پیدا کیا —

وہ عظیم ہستی جس نے تخلیق پاکستان جیسا معجزہ کر دکھایا، میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا، یہ سعادت میرے نصیب میں نہ تھی، لیکن مجھے یہ شرف ضرور حاصل ہوا ہے کہ مجھے کئی بار اس عظیم مرد مومن کی زیارت خواب میں کئی مرتبہ ضرور میسر آئی ہے، اور یہی میرا سب سے بڑا اعزاز بھی ہے، اس ہستی کو میں نے کیسا پایا، وہ کیا تھے، یہ صرف ذہن کا سرمایہ ہے جو محفوظ ہے۔ اگر تحریر کیا جائے تو ایک کتاب کا موضوع بنتا ہے —

حضرت قائد اعظمؒ اور مہاتما گاندھی (ایک سنسنی خیز انکشافاتی اور تجزیاتی مطالعہ اور مقابلہ) میری کوشش ناتمام ہے، حقیر سی کاوش ہے، جس پر میں نے برصغیر کے ان دو بڑے سیاسی رہنماؤں کا دوسرے کئی مستند مصنفین اور محققین کی کتب سے آراء اکٹھی کر کے تجزیہ پیش کیا ہے، یہ موضوع دیکھا اور پڑھا جائے تو ایک ضخیم کتاب کا تقاضا کرتا ہے، لیکن میں نے انتہائی مختصر اور جامع انداز میں اپنے ٹوٹے پھوٹے خیالات کو مجتمع کیا ہے، کہ کون کیا تھا۔ کس نے کیا کچھ کیا، کس نے کیا پایا، کس نے کیا کھویا، میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میری یہ معمولی سی کوشش اس پورے

موضوع پر محیط ہوگی۔ لیکن اتنا خیال ضرور پیش نظر ہے کہ میں نے اپنے ذوق و شوق کی روشنی میں ایک موہوم سی کاوش ضرور کی ہے۔ میں اپنے قارئین کرام کی علمی سطح پر اگر نہ پہنچ پاؤں تو معذرت کا طلب گار ہوں، بہر کیف ان کی قیمتی آراء، مشوروں اور تجاویز کا خیر مقدم بحیثیت حضرت قائد اعظمؒ کے ایک طالب علم کے ضرور کروں گا، میرے لئے یہ سعادت ہوگی۔

تو اگر تقدیر نو فراہمی رداست!

زانکہ تقدیرات حق لا انتہا است!

پروفیسر محمد مظفر مرزا

N-794 سمن آباد، لاہور

شعبہ سیاسیات

گورنمنٹ کالج لاہور

20836

کون کتنا بڑا تھا

حضرت قائد اعظمؒ ”خدا تعالیٰ کی ایک شاہکار تخلیق تھے۔ اگر دنیا کے سیاسی قائدین کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو حضرت قائد اعظمؒ ”سب سے بلند اور ارفع و اعلیٰ مقام کے مالک نظر آئیں گے، انہوں نے ایک خاص مقصد حیات کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتیں اور قوتیں پابند ضوابط رکھیں، بچپن سے لے کر جوانی تک اور پھر جوانی سے لے کر زندگی کے آخری سانس تک انہوں نے ”کمپیوٹرائزڈ“ زندگی بسر کی۔ ان کی تمام زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہو گا کہ ایک کامل ترین زندگی، بھرپور زندگی اور انقلاب آفرین زندگی کے حامل تھے، ان کی شخصیت و کردار میں کہیں بھی ذرا ابھر جھول دکھائی نہیں دیتا۔

گاندھی عمر میں حضرت قائد اعظمؒ ”سے سات برس بڑے تھے، ان دونوں شخصیات کی مادری زبان گجراتی تھی، لیکن علمی زبان انگریزی ہونے کے ناطے، یہ زبان تمام زندگی عملی طور پر مستعمل رہی، گاندھی کا خاندان پور بندر سے بعد میں راج کوٹ منتقل ہوا اور حضرت قائد اعظمؒ کا خاندان راج کوٹ سے کراچی منتقل ہوا، جہاں ان کے والد جناح پونجانبے چڑے کے کاروبار میں دلچسپی لینی شروع کی اور بالآخر کراچی کے متمول تاجروں میں شمار ہونے لگے، یہ قدرت کا کرشمہ تصور کیا جائے یا حسن اتفاق کہ گاندھی انگلینڈ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد راجکوٹ سے بمبئی پہنچے اور حضرت قائد اعظمؒ ”انگلینڈ سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد کراچی سے بمبئی پہنچے اور خدا تعالیٰ نے برصغیر کی دونوں شخصیات کو بمبئی ہائی کورٹ میں پریکٹس کے لئے آمنے سامنے کھڑا کر دیا۔

گاندھی کچھ عرصہ بعد برطانوی حکومت کی طرف سے ڈیکورنگ ایجنٹ کی حیثیت سے جنوبی افریقہ میں بھیج دیئے گئے۔ اور حضرت قائد اعظمؒ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے اپنی مخصوص ڈگر پر جے اور ڈٹے رہے۔

حضرت قائد اعظمؒ نے اپنا مقام انتہائی تنگ و دو، سخت محنت و مشقت اور جاں سوزی سے حاصل کیا تھا، ان کے خاندان میں کوئی ایسی بڑی مثال بھی نہ تھی کہ جس سے متاثر ہو کر وہ اپنی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کر سکتے، کوئی اتنی بڑی شخصیت بھی نہ تھی جو انہیں رہنمائی، تعلیم اور ہدایت سے ہمکنار کر سکتی، انہوں نے تو اپنا مقام خالصتاً اپنی ذاتی کاوشوں کے بل بوتے پر حاصل کیا تھا، محترمہ فاطمہ جناح تحریر فرماتی ہیں۔

”بہمی ہائی کورٹ میں بیرسٹری کی حیثیت سے اپنا نام درج کرانے کے بعد کسی مقدس مذہبی فریضے کی طرح روزانہ عدالتوں کے چکر لگانا اور مہینوں ایک روپیہ کمائے بغیر شام کو اپالو ہوٹل کے محدود کمرے میں واپس آ جانا بہت ہی ناخوشگوار تھا، لیکن جب تکلیف دہ مہینے تین کرناک سالوں پر دراز ہو گئے۔ تو وہ فی الواقعہ شکستہ حال ہو گئے، اس وقت کراچی میں ان کے والد اور خاندان کو مقدمات اور مشکلات کا سامنا تھا، مگر وہ ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے تھے۔ یہ صورت حال ان کی توقعات کے قطعی برعکس تھی۔ جو انہوں نے کراچی سے بہمی روانہ ہونے سے پہلے قائم کی تھیں، مایوسیوں اور ناامیدیوں میں بھی انہوں نے اپنے ٹھانڈے برقرار رکھے لیکن وہ دل میں اپنی تشنہ آرزوؤں کی عدم تکمیل کی چھین لگاتا محسوس کرتے تھے۔

ان تمام تر مشکلات کے باوجود جن میں سے وہ گزر رہے تھے، انہوں نے اپنے سماجی روابط برقرار رکھے۔ وہ اکثر بہمی کی بہترین کلبوں میں آتے جاتے رہے، اور بہمی کے معززین شہر کے گھروں میں منعقد ہونے والی پارٹیوں میں بھی مدعو کئے جاتے۔ اپنی عمر کی تیسری دہائی کے شروع میں وہ ایک انتہائی پرکشش نوجوان تھے، وہ دبلے پتلے اور چھا جانے والی شخصیت کے مالک تھے۔

گاندھی پر ایک کتاب جو کلکتہ میں ۱۹۳۲ء میں انگریزی میں چھپی جس کا نام ہے ”مہاتما گاندھی اینڈ انڈیا سڑگل فار سواراج“ “Mahatma Gandhi and Indias” “struggle for Swaraj by B.Sengupta” اس کتاب کا مصنف تحریر کرتا ہے کہ ”گاندھی نے حکومت وقت کو اپنی تمام تر رضاکارانہ خدمات خوش دلی کے ساتھ مہیا کر دیں، جب کہ سلطنت کو ۱۸۹۹ء میں بائز کا چیئرمین درپیش تھا۔ چنانچہ گاندھی نے والنٹیر ایمبولینس کور تیار کی، اس کی وجہ سے گاندھی کی خدمات کی تمام اخبارات میں تشہیر ہوئی، اور پھر اسی خدمت کے صلے

میں انہیں جنگی تمغہ بھی حاصل ہو۔“ (مذکورہ بالا کتاب کا صفحہ نمبر ۵)

اسی کتاب میں آگے چل کر مصنف پھر رقمطراز ہے کہ ”میا دارام کے مقام پر ۲۲ مئی ۱۹۱۵ء میں تقریر کرتے ہوئے گاندھی نے سماجی اصلاحات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ہندوؤں کو انتباہ کیا اور کہا کہ میں نے محسوس کیا ہے کہ حقیقی ہندو ازم میں ایسے وہ لوگ شامل نہ ہوں جنہیں اچھوت کہا جاتا ہے۔ اور اگر یہ فرض کر لیا جائے یہ لوگ (اچھوت) ہندو ازم کا ضروری حصہ ہیں تو میں بذات خود ایسے ہندو ازم کے خلاف بغاوت پر اتر آؤں گا۔“ (مذکورہ بالا کتاب کا صفحہ نمبر ۶) یہ ہے وہ دو غلط سیاست جو گاندھی کی ساری سیاسی زندگی کا اوڑھنا بچھونا رہی، مہاتما نہت کے پرچار کا یہ عالم کہ بکری کا دودھ خوراک کا لازمی جزو تھا، لنگوٹی معتبر پہناؤ اور اچھوتوں کی بستی میں رہائش۔ گاندھی کے مقابلے میں حضرت قائد اعظمؒ کس ٹھوس عقیدے اور عوامی جذبے کے مالک تھے، اس ضمن میں ممتاز حسن مرحوم تحریر کرتے ہیں۔

”عام غریب مسلمان جناح کو کیا سمجھتے تھے، مجھے اس کا اندازہ ۱۹۴۶ء میں ہوا۔ جب جناح لندن کے مشرقی حصے کی ایک مسجد میں جمعہ کی نماز کے لئے تشریف لے گئے، لوگوں نے انہیں دیکھتے ہی صفیں کی صفیں خالی کر دیں تاکہ وہ سب سے آگے کی صف میں بیٹھ سکیں۔ اگرچہ انہوں نے آخری صف میں ہی بیٹھنا پسند فرمایا اور کہا کہ میں دیر سے آیا ہوں اور کسی اور جگہ کا مستحق نہیں۔ نماز ختم ہوئی تو چھوٹے چھوٹے بچوں نے انہیں گھیر لیا۔ وہ جناح صاحب کو قریب سے دیکھنے اور ان سے ہاتھ ملانا چاہتے تھے، ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو اپنی اپنی چھوٹی چھوٹی کاپیوں میں ان کے دستخط لینا چاہتے تھے، اس کے بعد ہر نمازی نے ان سے مصافحہ کیا۔ یہ خلوص اور عقیدت کا ایک بے مثال مظاہرہ تھا ایک شخص پر رقت طاری ہو گئی اور اس نے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی کہ اے خدا میری زندگی محمد علی جناح کو بخش دے۔ یہ سارے کا سارا مجمع غریب مسلمانوں کا تھا۔ کوئی ملاح تھا کوئی چھوٹا دوکاندار، کوئی خوانچہ فروش، جناح نے نماز کے لئے یہ مسجد خود منتخب کی تھی۔ ان کا ارشاد تھا کہ میں کسی ایسی مسجد میں جانا چاہتا ہوں جو کسی فرقے کے لئے مخصوص نہ ہو اور جس میں غریب مسلمان نماز پڑھتے ہوں۔“

ان کے خلوص اور اصول پرستی کی مثال مشکل ہی سے ملے گی۔ جو دیانت اور روحانی بلندی وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ صدیوں میں بھی پیدا نہیں ہوتی۔ تقسیم سے پہلے جب مختلف فرقوں اور گروہوں کی شریستگی اور فساد آمادگی کی خبریں آنے لگیں تو کچھ لوگوں نے جا کر ان کی خدمت میں عرض کی کہ مسلمانوں کو بھی ان کے مخالفین کی طرح ہتھیاروں اور گولہ بارود سے مسلح رہنا چاہئے۔ اور اس سلسلے میں قائد اعظمؒ کو اقدام کرنا چاہئے۔ قائد اعظمؒ یہ سن کر بہت برہم

ہوئے۔ اور کہنے لگے۔ کیا تم لوگ مجھے منافق سمجھتے ہو کہ ایک طرف تو صلح کی اپیل پر دستخط کروں اور دوسری طرف تمہارے لئے ہتھیاروں کا بندوبست کروں۔ میں ہرگز ہرگز کسی ایسی تحریک کی حمایت نہیں کر سکتا۔ خواہ وہ مسلمانوں کی طرف سے ہو۔ خواہ غیر مسلمانوں کی طرف سے۔

اس سلسلے میں مجھے ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ پیر زادہ محمد ذکاء اللہ مرحوم نے جو تقسیم سے پہلے شملے کے ایک سرگرم مسلم لیگی کارکن تھے۔ مجھ سے فرمایا کہ جب قائد اعظمؒ نے ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کی تحریک شروع کی۔ تو ان کے ساتھ بہت کم آدمی تھے۔ مجھے خیال ہوا کہ کچھ ایسے آدمیوں کو مسلم لیگ میں لانا چاہئے جو عوام کے مجموعوں میں تقریر کرنے کے عادی ہوں۔ ایک عرصے کی کوشش کے بعد میں نے ایک مشہور و مقتدر غیر مسلم لیگی مسلمان کو مسلم لیگ میں داخل ہونے کے لئے رضامند کر لیا۔ مگر شرط یہ تھی کہ لیگ ان کے گزارے کے لئے سو روپے ماہوار انہیں دیا کرے۔ میرا خیال تھا کہ انہوں نے اس قدر کم رقم مانگنے میں بڑے ایثار کا ثبوت دیا ہے۔ خوشی خوشی جناح کے پاس پہنچا اور ان سے کہا کہ دیکھئے قسمت نے یادری کی ہے اور ایک مشہور و معروف کانگریسی کارکن جو ایک خوش بیان مقرر بھی ہے مسلم لیگ میں آنے کے لئے تیار ہے۔ بشرطیکہ ہم اس کے لئے فقط سو روپے ماہانہ کا بندوبست کر دیں۔ اب آپ اجازت دیں تو معاملہ طے ہو جائے۔ اور اگر ضروری ہو تو ہم لوگ اس رقم کا بار لیگ کے مرکزی فنڈ پر بھی نہیں ڈالیں گے۔ خود ہی انتظام کر لیں گے۔ آپ کے کہنے کی دیر ہے۔ پیر زادہ صاحب مرحوم کا بیان ہے کہ قائد اعظمؒ میری بات سن کر مطلقاً خوش نہ ہوئے۔ بلکہ بلا توقف کہہ دیا کہ مجھے افسوس ہے کہ میں اس تجویز سے متفق نہیں ہوں۔ میں نے کہا کہ جناب والا میں نے تو سمجھا تھا کہ میں ایک اہم مرشد لے کر آپ کے پاس حاضر ہوا ہوں اور آپ میری تجویز کا خیر مقدم کریں گے۔ آخر آپ کے پاس کارکن ہیں ہی کتنے اور ان میں سے کتنے ایسے ہیں جو عام مسلمانوں پر اثر ڈال سکتے ہیں۔ جناح صاحبؒ نے کہا۔ دیکھو میاں تمہاری تجویز کو میں اس لئے قبول نہیں کر سکتا۔ کہ یہ کام مسلمانوں کا اپنا کام ہے۔ اور اسے کرنے کے لئے کسی مسلمان کو کوئی رشوت دینا میرے نزدیک قطعاً ناجائز ہے۔ اگر آپ کے دوست واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ انہیں مسلم لیگ میں آکر کام کرنا چاہئے۔ تو اس کے لئے شرطیں ٹھہرانا کیا معنی، دوسرے ہم ایک غریب قوم ہیں آپ کے دوست ہم سے صرف ایک سو روپے مانگتے ہیں۔ اگر ہم ان کی شرط منظور بھی کر لیں تو اس کی کیا ضمانت ہے کہ ہم سے زیادہ مالدار قومیں انہیں اس سے زیادہ رقم دے کر دوبارہ ہم سے نہیں چھڑا لیں گے تو ہم دل و جان سے ان کا استقبال کریں گے۔ جو روکھی سوکھی ہمیں میسر ہے۔ اس میں وہ بھی ہمارے حصے دار ہوں گے۔ لیکن اگر وہ پیشگی کوئی شرط کرنا چاہتے ہیں۔ تو بہتر ہو گا کہ جہاں ہیں وہیں رہیں۔ نتیجہ یہ ہوا

کہ وہ صاحب مسلم لیگ کا کام کرنے کو تیار نہیں ہوئے۔

(نقوش قائد اعظم) مضمون: سالار قوم تحریر: ممتاز حسن مرتبہ: پروفیسر رحیم بخش شاہین صفحہ نمبر ۱۱-۱۰)

حضرت قائد اعظمؒ کی بے پایاں تخلص کاوشوں، بے اندازہ ذہنی قابلیتوں اور مسلمانانِ ہند کے ضمن میں ان کی غیر متزلزل قیادت کی بنا پر خدا تعالیٰ نے انہیں بے شمار برکتوں اور عظمتوں سے ہمکنار کیا تھا انہوں نے برصغیر کی سیاست میں اپنا مقام اپنی محنت شاقہ اور شبانہ روز کاوشوں سے بہت جلد پیدا کر لیا تھا۔ ان کے مقابلے میں گاندھی جو ہندو اکثریت کا سیاسی قطب مینار تھا، وہ حیثیت اور مقام حاصل نہ کر سکے۔ جناب پروفیسر محمد منور مرزا تحریر کرتے ہیں۔ کہ ”مما تمنا گاندھی جنوری ۱۹۱۵ء میں افریقہ سے لوٹے تھے، اور انہیں بمبئی کی پبلک سے متعارف کرانے کے خواہاں کانگریسیوں نے بقول بکنیک چند جلے کئے۔ ان میں سے دوسرے جلے کی صدارت کرنے کے لئے قائد اعظمؒ سے خصوصی درخواست کی گئی تاکہ قائد اعظمؒ کی جاذب شخصیت کی بدولت زیادہ لوگ آئیں اور گاندھی جی سے متعارف ہوں۔ ظاہر ہے کہ جب میثاق لکھنؤ وجود میں آیا۔ اس وقت ابھی گاندھی جی کانگریس میں کسی اہمیت کے مالک نہ تھے، لہذا وہ لکھنؤ پیکٹ کے وجود میں آنے کی راہ نہ روک سکے۔“

(مسلمانوں کا ایثار اور آزادی کی جنگ مصنف عبدالوہید خان مقدمہ از پروفیسر محمد منور مرزا صفحہ نمبر ۱۱)

ہماری نئی نسل کو چونکہ ہندو سے پالا ہی نہیں پڑا۔ لہذا وہ یہ سمجھنے کی صلاحیت سے قاصر ہے کہ ہندو کیا ہے؟ یہ وہ بر خود غلط قوم جو انتہائی مکار اور عیار ہے جس کا ظاہر اور باطن کا تعین کرنا مشکل ہے، ہیرا پیمیری، فریب کاری اور دھوکہ دہی میں جواب نہیں رکھتے۔ مگر افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے کچھ وہ پاکستانی حضرات جنہوں نے انگریزی دور حکومت دیکھا ہے ہندو کی چہرہ دسنیوں اور مظالم کو بچشم خود دیکھا۔ متحدہ ہندوستان کی تقسیم کو غلط تصور کرتے ہیں۔ وہ اپنی نئی نسل کو ہندو ذہنیت کے باب میں کیا تربیت کرتے ہوں گے۔

حضرت قائد اعظمؒ نے مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن (جالندھر) کے اجلاس میں جو ۱۹۳۲ء میں منعقد ہوا تھا۔ آپ نے فرمایا ”مشکل یہ ہے کہ گاندھی جی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں اور جو ان کا در حقیقت مقصد ہوتا ہے اسے کبھی زبان پر نہیں لاتے۔“

اگست ۱۹۳۵ء کے ایک جلے سے خطاب کرتے ہوئے حضرت قائد اعظمؒ نے فرمایا تھا۔ ”ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے۔ وہ گرگٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کے

(یعنی مہاتما گاندھی کے) یہاں مفید مطلب نہیں ہوتا تو وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندہ نہیں ہیں وہ محض انفرادی حیثیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ وہ کانگریس کے چار آنے کے ممبر بھی نہیں ہیں۔ اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کا واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ جب اور حربوں سے کام نہیں چلتا تو مرن برت رکھ لیتے ہیں۔ جب کوئی دلیل نہ بن پڑے تو ”اندرونی آواز“ کو بدل لیتے ہیں۔ کئے ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کریں وہ تو ایک چیتاں ہیں، معممہ ہیں“ —

یہ تھی گاندھی کی سیاسی حیثیت، ان کا سیاسی موقف اور ان کا سیاسی نظریہ اس کے باوجود ہندوؤں کے گرو دیو اور مہاتما۔ جس قوم کے کمندار اعلیٰ کے اخلاق، اصول اور ضابطہ حیات یہ ہو گا اس قوم کی مجموعی ذہنیت اور اجتماعی اخلاق و ضوابط کا کیا کنٹرا — ایسا قائد اگر اسلامیان ہند کے بارے میں اپنی ہمدردیاں اور وفاداریاں جتلائے تو ان کا مفہوم کیا ہونا چاہئے چنانچہ تحریک پاکستان جیسے اپنے مراحل طے کر رہی تھی گاندھی اتنے ہی غمزہ اور پریشان رہتے تھے جب پاکستان کا ریزولوشن پاس ہوا تو مسٹر گاندھی کے تن بدن میں آگ لگ گئی چنانچہ انہوں نے ۷ مارچ ۱۹۴۰ء کو اپنے بیان میں کہا۔

”میں پوری جرأت و جسارت کے ساتھ اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیال حضرات اپنی اس روش سے اسلام کی کوئی خدمت سرانجام نہیں دے رہے بلکہ وہ اس پیغام کی غلط ترجمانی کر رہے ہیں جو لفظ اسلام کے اندر پوشیدہ ہے۔ مجھے یہ کہنے میں ضرورت اس لئے پیش آئی کہ آج کل مسلم لیگ کی طرف سے جو کچھ ہو رہا ہے اس سے میرے دل پر سخت ٹھیس لگ رہی ہے۔ میں اپنے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کروں گا اگر میں ہندوستان کے مسلمانوں کو اس دروغ گوئی سے متنبہ نہ کر دوں جس کا اس نازک وقت میں ان میں پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے۔“

(ہندو کیا ہے؟ انجمن اشاعت نظریہ پاکستان، صفحہ نمبر ۲۱)

مگر دوسری طرف حضرت قائد اعظمؒ کا معیار اخلاق و سیاست یہ تھا کہ انہوں نے مسلمانوں سے تو کیا ہندو قوم اور انگریز قوم کو بھی کبھی درغلانے یا دھوکہ دینے کی کبھی کوشش ہی نہ کی تھی، وہ ان باتوں کو بد اخلاقی اور بے ایمانی تصور کرتے تھے۔

نوائے وقت ۲۸ دسمبر ۱۹۹۱ء کے سرراہے میں، سکھوں کے حوالے سے بڑا خوبصورت مضمون باندھا گیا ہے جسے ذیل میں درج کرنا ضروری سمجھتا ہوں، —

”آزاد خالصتان کے لئے جدوجہد کرنے والی سکھوں کی عالمی تنظیم بہر خالصہ انٹرنیشنل۔

یوم قائد اعظم کے حوالے سے پاکستانیوں کو خصوصی پیغام بھیجا ہے جس میں قائد اعظم کی قائدانہ صلاحیتوں کو شاندار خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اگر سکھوں کو بھی قائد اعظم جیسا رہنما مل جاتا تو آج ان کا شمار بھی دنیا کی آزاد اقوام میں ہوتا۔ خط میں ہندو سامراج کے مظالم کا ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ کس طرح ہندو سامراج سکھ، بونیشوں کی عصمتوں کے آنچل تار تار کر رہا ہے۔

ہر قوم اپنی زبان سے اپنے لیڈر کی تعریف کرتی رہتی ہے۔ لیکن سچی تعریف وہی ہے جو نبیوں کی زبان سے ہو۔ قائد اعظم کی تعریف کرنے پر نہ صرف سکھ مجبور ہیں بلکہ بعض ہندو دانشوروں نے بھی قائد اعظم کو شاندار خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ مسز سروجنی نائیڈو جسے ہندو باپ نے ”بلبل ہند“ کا خطاب دے رکھا تھا، قائد اعظم کے بارے میں کہتی ہیں کہ اگر مسلم لیگ کے پاس سرود اور گاندھی جیسے ہزاروں لیڈر ہوتے تو وہ کبھی پاکستان بنانے میں کامیاب نہ ہوتے۔ لیکن کانگریس کے پاس اگر ایک بھی جنم ہوتا تو ہندوستان کبھی تقسیم نہ ہوتا۔“

(روزنامہ نوائے وقت، ۲۸ دسمبر ۱۹۹۱ء، سرراہے)

حضرت قائد اعظم اگر مادی اور جسمانی ہوس کے متقید ہوتے، تو انہیں برصغیر میں ہر شے بے سر آسکتی تھی۔ لیکن انہوں نے ہندو اکثریت اور انگریز حکومت کو ثابت کر دیا تھا کہ انہیں نہ خریدا، نہ ہی بیچا جاسکتا ہے۔ ہندوؤں اور انگریزوں نے کیا کیا لالچ اور چکاچوند نظارے نہ دکھائے ہوں مگر اس مرد مومن کے پائے استقلال پر ذرا بھر لرزہ پیدا نہ ہوا۔ ان کی شخصیت ایک کامل بن شخصیت تھی۔ ان کے قلب و دانش میں باہمی آویزش کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ مزاجاً ٹھوس، غیر متزلزل طبیعت کے مالک تھے۔ لہذا یہ بات آسانی سے کہی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے ضمیر کی رالت میں بھی سرخرو تھے اور اپنی ملت کے افراد کی نظروں میں بھی عزت آتے تھے۔ انہوں نے تمام عمر جس چیز کا خیال رکھا وہ ان کا استحکام کر دار تھا، جس پر تاریخ آج تک یہ ثابت نہ کر سکی کہ انہوں نے کبھی غفلت کا ارتکاب کیا ہو۔ اس ضمن میں ان کی زندگی ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسلامیان ہند کا ان کی ذات پر مستحکم ایمان اور یقین اسی وجہ سے تھا۔ ان کی شخصیت کے اس پہلو کو بچپن سے لے کر بڑھاپے تک پرکھا جائے تو یوں لگتا ہے جیسے انہوں نے دینہ زندگی بسر فرمائی۔

ایک طرف کردار کی مضبوطی کا یہ عالم تھا تو دوسری طرف مہاتما گاندھی جو برصغیر کی ہندو قومیت کے باپ اور مہاتما نہتیت کے علمبردار، خود ہی اپنی خود نوشت جس کا نام ہے، ”تلاش حق“۔ اس میں تحریر کرتے ہیں۔ ”میری شہری کے دور ان ہماری تیل گاڑی الٹ گئی، جس سے میرے

والد شدید زخمی ہو گئے۔ میں شادی کی دلچسپیوں میں اپنے زخمی والد کو بھول گیا۔ کیونکہ نفسیاتی خواہشات مجھ پر غالب آ گئی تھیں۔ اگرچہ میری شادی ہو چکی تھی مگر میں بہت کمزور اور بزدل تھا رات کو گھر سے باہر قدم رکھنے کی ہمت نہ ہوتی تھی اندھیرے میں سونا ممکن نہ تھا۔ مجھے وہم تھا کہ ایک طرف سے بھوت آرہے ہیں، دوسری طرف سے چور، تیسری طرف سے سانپ، میں اپنے خوف کو اپنی بیوی پر بھی ظاہر نہ کر سکتا تھا اگرچہ وہ میرے کمرے میں سوتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ اسے اندھیرے میں کسی طرح کا ڈر نہ لگتا تھا۔ مجھے سگریٹ کا دھواں اچھا لگتا تھا۔ سگریٹ پینے کے لئے ہم نے نوکروں کی جیبوں سے پیسے اڑانا شروع کر دیئے۔ جب میری عمر بارہ سال کی تھی تو میں نے پہلی چوری کی اور اپنے بھائی کے بازو بند سے سونے کا ایک ٹکڑا چرایا۔ اسے بیچ کر میں نے وہ قرض ادا کیا جو سگریٹ نوشی کے سلسلے میں مجھ پر ہو گیا تھا۔

یہ بات مجھے بہت بری محسوس ہوتی تھی۔ کہ ہم بڑوں کی اجازت کے بغیر کچھ بھی نہیں کر سکتے۔ چنانچہ زندگی سے تنگ آ کر ہم نے خود کشی کی ٹھان لی۔ سنا تھا کہ دھتورے کے بیج ہر قاتل ہوتے ہیں۔ جنگل سے بیج لائے اور شام کا وقت خود کشی کے لئے مقرر کیا رات آئی توجی ڈوبنے لگا اور سوچا کہ آزادی نہ سہی غلامی ہی سہی۔ مگر مرنے سے کیا حاصل۔ زندگی میں کچھ تو مزا ہے۔ مر کر کیا لیں گے۔

رات کا وقت تھا۔ میں اپنے والد کے پاؤں دبا رہا تھا جو بستر مرگ پر تھے۔ میرا دل سونے کے کمرے میں جانے کو چاہا، میں اندر گیا۔ تھوڑی دیر بعد نوکر نے دروازہ کھٹ کھٹایا اور کہا پتا جی گزر گئے..... میرا دل شرم سے ڈوبنے لگا کہ آخری وقت میں ان کے پاس نہ رہا۔

کلکتہ یونیورسٹی کے پروفیسر نرمل کمار بوس نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام ہے ”گاندھی جی کے ساتھ میرے ایام“۔ مصنف تحریر کرتے ہیں۔ ”گاندھی جنہیں ساری دنیا نے جانے کیا سمجھتی تھی۔ آدھی رات کے وقت کانپتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوتے اور اپنے قریب سونے والی کسی عورت سے کہتے کہ وہ انہیں پانچ دس منٹ تک اپنے گلے سے لگالے تاکہ ان کی کپکپاہٹ دور ہو جائے۔ میں چونکہ ان کے ساتھ رہتا تھا۔ لہذا اکثر یہ دیکھ کر کوفت ہوتی تھی۔ وہ دعویٰ کرتے تھے کہ اس طرح وہ اپنی پاکیزگی نفس کا امتحان لیتے ہیں۔ میری رائے میں یہ محض فریب تھا۔ کیونکہ گاندھی جی کی ستم رسیدہ وہ لڑکیاں ہسٹریا کا شکار ہو جاتی تھیں۔ اور ان کی شخصیت بری طرح متاثر ہوتی تھی۔

نرمل کمار بوس لکھتے ہیں کہ ان واقعات کو دیکھ کر مجھے گاندھی جی سے نفرت ہونے لگی اور میں نے انہیں چھوڑ دیا اور واپس چلا آیا۔ مگر اس مسئلے پر میری ان سے خط و کتابت جاری

رہی۔

گاندھی نے اپنی خود نوشت کتاب میں لکھا ہے، کہ ”میری بیوی کے بچہ ہونے والا تھا۔ افریقہ میں کسی رائی کا بندوبست نہ ہو سکتا تھا۔ میں نے حواس قابو میں رکھ کر رائی کے فرائض ادا کئے۔ اس طرح بچہ پیدا ہو گیا۔ اور مجھے یقین ہو گیا کہ بچہ کی پیدائش کا مشغلہ قومی خدمت کے منافی ہے اور اگر مجھے قومی خدمت کرنی ہے تو مجھے تجربہ کی زندگی بسر کرنا ہوگی۔ یہ سوچ کر میں نے ”برہم چاری“ ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ گاندھی نے برہم چاری ہونے کا جوڑھونگ رچایا تھا یہ ہے اس کا پس منظر۔

نرمل کلر بوس کے ایک خط کے جواب میں گاندھی لکھتے ہیں۔

”آپ کا یہ قیاس غلط ہے کہ میرے ان تجربات سے عورت کا مقام کم ہوتا ہے۔ میری رائے میں برہمچاریہ کا حلف اٹھانے سے پہلے بیوی تک میری نظر میں حقیر تھی۔ لیکن اس حلف کے بعد میری بہن بھی میرے ساتھ لیٹ جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔“

گاندھی آخری وقت تک دو لڑکیوں کے گاندھے پر ہاتھ رکھ کر چلتے تھے۔ یہ لڑکیاں گاندھی کی بیساکھیاں یا چھڑیاں کہلاتی تھیں ان میں سے ایک منو گاندھی تھی۔ جس نے ”باپو میری ماں“ کے نام سے گاندھی کے ساتھ اپنی زندگی کے حالات لکھے ہیں۔ منو کی ماں مرتے وقت اس کا ہاتھ گاندھی کے ہاتھ میں دے گئی تھی اس وقت منو بارہ سال کی تھی۔ گاندھی نے اسے پالا۔ وہ لکھتی ہے کہ جب میری عمر ۱۹ برس کی ہوئی تو گاندھی مجھے اپنے کمرے میں سلائے لگے۔ دوسری لڑکی کا نام ابھا ہے۔ یہ ابھی تک زندہ ہے اس کا کہنا ہے کہ ایک دفعہ میرے شوہر کانو گاندھی کے پاس گئے اور ان کے ساتھ میرے سونے پر اعتراض کیا۔ اور کہا ”باپو اگر رات میں آپ کو سردی لگتی ہے۔ اور آپ صرف گرمی حاصل کرنے کے لئے کسی کو اپنے ساتھ سنانا چاہتے ہیں تو مجھے اس خدمت کا موقع دیجئے۔ مگر گاندھی نہ مانے۔“

متحدہ ہندوستان کے آخری وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی پہلی برسی کے موقع پر رچرڈ ہوف کی جو کتاب شائع ہوئی ہے۔ اس میں اس نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی خوبصورت بیوی ایڈونا کے پنڈت جواہر لال سے معاشقہ کی داستان ہی نہیں چھپائی بلکہ اس کے متعدد معاشقوں پر روشنی ڈالی ہے۔ حتیٰ کہ یہاں تک لکھا ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح ”کو دایم تزویر میں پھانسنے کے لئے یہ چکر چلایا گیا۔ لیکن قائد اعظم“ کو سوائے حصول پاکستان کے کسی بات سے دلچسپی نہ تھی۔ رچرڈ ہوف نے لکھا ہے کہ ”گاندھی بھی ایڈونا کے سحر کا شکار ہو گیا تھا۔“ رچرڈ ہوف نے اپنی اس کتاب کا نام ”ماؤنٹ بیٹن ہمارے دور کا ہیرو“ رکھا۔ رچرڈ ہوف برطانوی بحریہ سے متعلق رہا ہے اور

اس نے ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ دور دراز کے سفر طے کئے ہیں۔

مہاتما گاندھی اپنے آپ کو اہمسا کا اوتار کہتے تھے۔ اہمسا کا مطلب یہ ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو تشدد کا استعمال نہ کیا جائے۔ انجیل کے مطابق ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دینے سے انجیل کی تعلیم پر عمل کا اظہار ہے۔ لیکن گاندھی کا اپنا یہ عمل تھا کہ سندھ میں غالباً ۱۹۳۹ء میں مسجد منزل گاہ کے سلسلہ میں ہندو مسلم فساد ہو گیا اور ہندوؤں نے مسلمانوں پر بے حد مظالم ڈھائے۔ یہ سب کچھ کرنے کے بعد کوئٹہ کے اصول سیاست کے مطابق واپس شروع کر دیا اور مہاتما گاندھی کو تار کے ذریعے مسلمانوں پر تشدد کا الزام دھرا۔ اہمسا کے اوتار گاندھی نے بلا تحقیق و تفتیش اپنے اخبار میں لکھا۔

”اہمسا ایک دن میں نہیں سیکھا جاتا۔ دوسرا طریق یہ ہے کہ جیسے دنیا برقی چلی آئی ہے۔ یعنی جان و مال کی حفاظت ہتھیاروں کے ذریعے کی جائے۔ سندھیوں (ہندوؤں) کو چاہئے کہ لٹیروں اور حملہ آوروں سے اپنی حفاظت کا ڈھنگ سیکھیں۔“ (اخبار۔ ہریجن مورخہ ۱۲-۲-۳۹)

اسی اہمسا کے اوتار نے جنگ عظیم دوم کے آغاز پر انگریزوں سے کہا تھا کہ بظنر کا مقابلہ ہتھیاروں سے نہ کرو۔ اہمسا (عدم تشدد) کے ذریعے کرو۔

عبد الغفار خان کو گاندھی نے اپدیش دیا تھا کہ پٹھانوں سے چاقو چھین لو تاکہ اہمسا (عدم تشدد) میں ذرا سی بھی تشدد کی لاگ نہ رہے اور دوسری طرف کلکتہ کی عورتوں کو تاکید کی جارہی تھی کہ اپنے پاس پستول اور بندوق رکھو اور فائر کرنا سیکھو۔

حضرت قائد اعظمؒ نے گاندھی کے ضمن میں بڑی خوبصورت رائے دی تھی۔ انہوں نے ایک مرتبہ فرمایا، ”مشکل یہ ہے کہ مسٹر گاندھی کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان سے کہتے ہیں۔ اور جو ان کا درحقیقت مقصد ہوتا ہے اسے وہ زبان پر نہیں لاسکتے“

ایک دن گاندھی جی شوگرام آشرم میں اپنی کتیا میں بیٹھے پرارتھنا میں محو تھے کہ ایک کونے سے ایک سانپ اندر گھس آیا۔ مہاتما جی خاموشی میں اپنی پرارتھنا میں مصروف رہے۔ سانپ نے کتیا کا چکر کاٹا اور آہستہ سے واپس چلا گیا۔ ہندو اخبارات نے اسے مہاتما جی کی کرامت قرار دے کر خوب اچھالا۔ صبح کو یہ خبر اخبارات میں شائع ہوئی۔ تو ایک اخبار کارپورٹر قائد اعظمؒ کے پاس آیا اور اس واقعہ کا ذکر کرنے کے بعد ان سے پوچھا کہ آپ کا اس کے متعلق کیا خیال ہے۔ قائد اعظمؒ نے سر ہلایا اور نہایت سنجیدگی سے فرمایا، ”ہاں، یہ پیشہ ورانہ آداب تھے“۔ یعنی سانپ اور گاندھی ہم پیشہ تھے۔ اس لئے سانپ نے انہیں کچھ نہیں کہا۔ یہ وہ لطیف طنز ہے جس

کا لطف لیا جاسکتا ہے سمجھایا نہیں جاسکتا۔

(مقصد پاکستان — مصنفہ ظہیر الاسلام فاروقی، صفحہ نمبر ۱۳۵ - ۱۳۱)

”وہ قوم جس کے معبود آدھے انسان ہوں اور آدھے حیوان، ان کے کئی کئی سر ہوں، کئی کئی زبانیں اور کئی کئی دست و بازو تو ایسی قوم اپنے بتوں ہی کی طرح بلند شعار اور عالی فکر ہوگی۔ پھر اگر وہ کئی کئی ہاتھ دکھائے۔ بیک وقت کئی کئی متضاد باتیں کرے، ظلم کو کرم جانے اور کرم کو ظلم، ایفا کو وغا فرض کرے اور برعکس کو برعکس تو کوئی ایسے اچھے کی بات نہیں۔ لہذا ہندوؤں کے قائد اگر تضادات کے بادشاہ بھی ہوں تو ہندو قوم کی نفسیات کو یا ضمیر کو کوئی دھچکا نہیں لگتا۔ اول تو یہ کہ ایسی اجتماعی نفسیات کے عالم میں کسی ضمیر کا تعین کیا معنی رکھتا ہے۔ نواب بہادر یار جنگ مرحوم نے حمید نظامی مرحوم کے ایک خط کے جواب میں مندرجہ ذیل دلچسپ کلمات قلمبند کئے تھے۔

”مجھ سے لوگ اکثر شکایت کے انداز میں کہتے ہیں کہ ہندو اپنے ناقص کو بھی آسمان پر پہنچاتا ہے اور مسلمان اپنے کامل کی بھی ٹانگ کھینچتا ہے۔ میں اس میں مسلمان کا نقص نہیں، حسن دیکھتا ہوں ہندو کا ناقص بہر حال اس کی گائے، گزگا، پتیل اور سنگ ہائے ناشر استدہ سے اچھا ہے جو اس کے لئے معیار کمال ہے اور مسلمانوں کا کامل بھی مسلمان کے معیار کمال یعنی قرن اول کی قیادت پر پورا نہیں اترتا۔“

(مکاتیب بہادر یار جنگ صفحہ نمبر ۵۴۸ بہادر یار جنگ اکیڈمی، کراچی)

ہندو اور مسلمان کے مزاج میں بنیادی فرق اور ہے۔ اس باعث دونوں قوموں کی اجتماعی نفسیات کا اختلاف ہے۔ ایک خدا، ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ایک کتاب پر ایمان رکھنے والی قوم، نارتھ یاب ہونے کے باعث عملاً پست اور ذلیل بھی ہو جائے تو بھی اس کے معیار پست اور ذلیل نہیں ہوتے۔ دوسری طرف نراو چودھری، ہندو ہوتے ہوئے، ہندو قوم کی اس صورت حال پر روشنی ڈالتے ہیں کہ ہندو کی نفسیاتی روح پر تضاد کی قسم کی کوئی خراش نہیں آئی۔ اس لئے کہ وہاں اس قسم کی ہر شے داخل و شامل مزاج ہو کر گھل مل جاتی ہے اور فٹ بیٹھتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جو قوم ہر طرح کے عقیدے کی مالک ہو کر بھی اور اس کی دشمن ہو تو بھی ہندو ہی رہے اسے تضاد کا شعور ہو کیونکر؟ نراو چودھری کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ ہندو کی شخصیت ہیبت ناک حد تک دوغلی ہوتی ہے یہ خود اپنی ذات میں اپنے ہی خلاف منقسم رہتا ہے اور یہی اس کی ساری تاریخ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہر کہیں انسانی وجود میں تضاد موجود ہوتے ہیں۔ لیکن اصول عام یہ ہے کہ فضائل کا ایک مجموعہ اپنے متضاد و متخالف پہلوؤں کو پیچھے دھکیل کر حاوی ہو جاتا ہے۔ مگر ہندوؤں کے یہاں ایک طرح کے فضائل، متضاد فضائل کو دبانے کی بجائے ایک دوسرے کو نہ ادھر

کارہنے دیتے ہیں نہ ادھر کا۔ اس طرح کھینچا تانی جاری رہتی ہے اور کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ لہذا ان کے افعال و اعمال نامعقول ہو کر رہ جاتے ہیں۔۔۔“

(The Continent of Circe by Nirad.C Chaudhri

P-97)

نرا دسی چوہدری کا مطلب یہ ہے کہ ہندوؤں کے یہاں کوئی خصلت حاوی نہیں ہوتی ابھی یہ ابھی وہ، ابھی کچھ اور ابھی کچھ اور ظاہر ہے کہ اتنے معبودوں اور اتنے رنگوں والے اور بلند و پست معبودوں کے حضور سجدہ ریز ہونے والوں کی مجموعی اور اجتماعی نفسیات ہو بھی کیا؟ نرا دسی چوہدری اسی صفحہ پر بعض بیک وقت پائے جانے والے ان متضاد خصائل کا، جو ہندوؤں کی اندرونی اور بیرونی سیاست پر خاص طور پر اثر انداز ہوتے ہیں، ذکر کرتے ہیں اتفاق و اتحاد کے شعور کے ساتھ ساتھ انتشار اور کھنڈت کی جانب بے پناہ میلان، اجتماعی ڈھنگ اور گھمنڈ کے ترانے گانے کے ساتھ ساتھ بیچ سیرزی کا ذوق، غیر ملکیتوں (اجانب) سے شدید نفرت کے ساتھ ساتھ تخریب پسندانہ انفرادیت، تشدد کے ساتھ عدم تشدد، جنگ پسندی کے ساتھ امن جوئی، سب کچھ قبضہ لینے کی ہوس کے ساتھ ساتھ اپنی ملکیت سے بے نیازی، شجاعت کے ساتھ ساتھ بزدلی، ہوشیاری کے ساتھ ساتھ حماقت، یہ جملہ متضاد اوصاف بیک وقت موجود نہ ایک پہلو حاوی نہ دوسرا۔ چنانچہ کوئی کچی بات، کوئی ایک راہ، کوئی ایک طرز عمل، کوئی ایک معین نظریہ وغیرہ کی سی چیزیں ہندو کی سمجھ ہی میں نہیں آتیں۔ یہاں ہم مہاتما گاندھی کی مثال پیش کرتے ہیں جو ہندو قوم کے دور جدید کے ”اوتار“ ہیں۔ وہ اس روشن اور جمہوری دور کے ہندو معاشرے کے نمائندے اور خود ہندوؤں کے خیال میں ان کے صادق ترین ترجمان ہیں۔ انہی کی مثال سے (اور ان کے ”اوتار“ پر ہندو کے ایمان کے پیش نظر) پورے ہندو معاشرہ کو سمجھا جاسکتا ہے۔ مہاتما گاندھی لکھتے ہیں۔

”میں جب لکھتا ہوں تو ہرگز یہ خیال نہیں کرتا کہ پہلے کیا لکھ چکا ہوں میرا مقصد یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کسی خاص مسئلہ پر میں جو کچھ پہلے بیان دے چکا ہوں، اس کے ساتھ ہم آہنگ رہوں۔ میرا مقصد تو یہ ہوتا ہے کہ جو صداقت ایک خاص لمحے میں مجھے جس طرح دکھائی دیتی ہے اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کروں۔“

(The Moral Political Thought of Mahatma Chandhi by

Raghwan N.Iyer P-12)

سردار سردول سنگھ کولیشتر کہتے ہیں۔ کہ ”مہاتما گاندھی کی صداقت، ناصداقت پر استوار

ہے اور ان کا عدم تشدد، تشدد دانہ صداقت ہے۔“

(Gandhism Verses Commonsense—P-12)

وہ ذکر کرتے ہیں کہ میں نے کیوئل ایوارڈ کے باب میں کہا کہ آپ کی قرار داو ہے، ”ہم کیوئل ایوارڈ کو نہ منظور کرتے ہیں اور نہ نامنظور بھی۔ اسے یوں بھی کہا جاسکتا ہے ہم کیوئل ایوارڈ کو منظور بھی کرتے ہیں اور نامنظور بھی۔“ گاندھی بولے ”تمہاری تجویز بیجی نہیں“ حالانکہ دکھ کی بات یہ ہے کہ ان کا اپنا اظہار بھی اتنا ہی مضحکہ خیز تھا۔“

(Gandhism Verses Commonsense -P-12)

لارڈ سٹنٹھگم کا بیان ہے کہ جب جنگ عظیم دوم شروع ہوئی تو مہاتما گاندھی اور قائد اعظمؒ کو الگ الگ مشورے کے لئے بلایا گیا۔ گاندھی نے باتوں باتوں میں آنسو بہانا شروع کر دیئے کہ پارلیمنٹ ہاؤس پر جرمن بم برسیں گے۔ ویسٹ منسٹر لیبے برباد ہو گا، کیا بنے گا! میں اس جنگ پر اس طرح غور کرتا ہوں گویا میرا دل ایک انگریز کا دل ہے۔ ظاہر ہے کہ لارڈ سٹنٹھگم مت متاثر ہوا۔ لہذا اس نے یہاں تک کہا کہ میں نے یہ بندوبست بھی کر دیا ہے کہ آپ کو تازہ

سورت حال سے آگاہ رکھوں۔“ (The Viceroy At Bay P.136-243)

مگر سچائی کے دیوتا وائسرائے کے یہاں سے اٹھے اور اگلے روز کانگریس کی ورکنگ کمیٹی سے جا کے برطانیہ کی جنگی مساعی کے باب میں کامل عدم تعاون کارپوریوشن منظور کرادیا۔

مہاتما گاندھی کے بارے میں ایک بار قائد اعظمؒ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ”کوئی شخص مسٹر گاندھی سے کس طرح بات کرے۔ ان کی کئی حیثیتیں ہیں اور وہ حیثیتیں بدلتی رہتی ہیں۔ مثلاً ان کی ذاتی حیثیت، کانگریس کے ڈکٹیٹر کی حیثیت، پھر یہ حیثیت کہ وہ کانگریس کے چار آنے کے ممبر بھی نہیں، تیسری حیثیت یہ کہ وہ ہندو مسلمان سب کے نمائندے ہیں۔ چوتھی حیثیت اور وہ سب سے عظیم ہے اور وہ ان کی مہاتمائی ہے اور پھر یہ کہ ان کی اندرونی آواز ہے اور اس آواز کی ذیل کا حق انہی کو اور فقط انہی کو پہنچتا ہے۔ غرض کوئی آدمی یہ نہیں جان سکتا کہ مسٹر گاندھی کس خاص وقت میں کس حیثیت کے مالک ہوں گے۔“

(مسلمانوں کا اٹھار اور آزادی کی جنگ۔ مصنفہ عبدالوحید خان دیباچہ از پروفیسر محمد منور

مرزا، صفحہ نمبر ۳۱۲ - ۳۰۸)

ایس کے موجددار جنہوں نے ”جناح اور گاندھی“ کے موضوع پر کتب ترتیب دی تھے ہیں۔ ”ہندوستان چھوڑ دو کا اقدام پوری طرح ناکام ہو گیا اور گاندھی نے دین کی سچائی کا جو دعویٰ کیا اس کی قیمت ہندوستان کو ادا کرنا پڑی۔ جناح نے کانگریس کی حماقتوں کا پورا پورا فائدہ

اٹھایا اور اپنی پوزیشن مسلم عوام اور حکومت برطانیہ کی نظر میں ایسی مضبوط کر لی کہ اب جناح اور مسلم لیگ کو چھیڑنے کی ہمت کسی کو نہ رہی۔ ہندوستان چھوڑ دو تحریک کے سلسلے میں کانگریس کی قیادت جیل میں تھی اور سیاسی میدان پوری طرح مسلم لیگ کے تصرف میں تھا اس موقع سے قائد اعظم نے فائدہ اٹھایا اور نچلے نہیں بیٹھے بلکہ اس دوران لیگ کی تنظیم کو مضبوط و مستحکم کرنے اور پاکستان کی تحریک سے عوام کو روشناس کرانے میں لگے رہے۔

(جناح اور گاندھی - مرتبہ ایس کے موجددار، صفحہ نمبر ۱۹۷ - ۱۹۶)

(ماخوذ از انسائیکلو پیڈیا قائد اعظم - مرتبہ زاہد حسین انجم، صفحہ نمبر ۲۱)

”قائد اعظم محمد علی جناح کے تمام سوانح نگار جن میں انگریز بھی شامل ہیں۔ قائد اعظم کی تین صفات محنت، دیانت اور جرأت کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کرتے ہیں۔ ان کے بدترین دشمنوں نے بھی اعتراف کیا کہ وہ ایک دیانت دار شخص تھے ان کی دیانت کی کئی مثالیں ہیں۔ یہاں سب کا ذکر کرنا تو محال ہے۔ تاہم چند ایک مثالیں دی جا رہی ہیں۔

پروفیسر ابو بکر حلیم نے آر سی ڈی سٹوڈنٹس ایسوسی ایشن کے زیر اہتمام ایک جلسے میں جو ۲۵ دسمبر ۱۹۶۷ء کو کراچی میں منعقد ہوا، اس میں انہوں نے بتایا۔

”ایک مرتبہ جنگ عظیم کے زمانے میں جب کار کی بیڑی پر کنٹرول تھا، قائد اعظم کی کار کی بیڑی خراب ہو گئی انہوں نے متعلقہ انگریز افسر کو اس بیڑی کے حصول کے لئے خط لکھا بعد ازاں کئی روز بعد ایک دعوت میں ان کی اس انگریز افسر سے ملاقات ہوئی تو قائد اعظم کے استفسار پر اس نے پوچھا کہ انہوں نے جنگی فنڈ میں کتنی امداد دی ہے۔ قائد اعظم نے اس سے کہا کہ وہ تحریری طور پر بات ان سے پوچھے۔ اس انگریز افسر نے کئی ہفتوں تک بیڑی کے حصول کے معاملے کو دبائے رکھا۔ قائد اعظم اس تمام عرصے میں تکلیف برداشت کرتے رہے لیکن انہوں نے بلیک سے بیڑی نہیں خریدی۔ کیونکہ یہ ان کے اصول کے خلاف تھا۔

”قائد اعظم محمد علی جناح ایماندار اور اصول پسند تھے۔ ایک مرتبہ بمبئی کے ایک تاجر عبدالکریم نے قائد اعظم کو ایک مقدمے میں وکیل مقرر کرنا چاہا۔ قائد اعظم نے فرمایا کہ میری فیس پانچ صد روپے روزانہ ہے۔ عبدالکریم نے کہا کہ میں اتنی بھاری فیس ادا کرنے کا تحمل نہیں۔ کچھ اور کم کریں۔ قائد اعظم نے انکار کر دیا۔ عبدالکریم نے قائد اعظم کے سامنے پانچ ہزار روپے کی رقم رکھتے ہوئے کہا کہ مجھے آپ کی پانچ صد روپے روزانہ کی فیس منظور ہے۔ لیکن سردست میرے پاس یہی رقم ہے۔ آپ مقدمے کی پیروی شروع کر دیں۔ باقی رقم میں مقدمہ کی پیروی کے دوران یا اختتام پر ادا کر دوں گا۔ قائد اعظم نے تین دن میں مقدمہ کی پیروی کر کے

مقدمہ جیت لیا اور عبدالکریم سے صرف تین دن کی فیس چھدرہ سو روپے وصول کر کے باقی رقم اسے واپس لوٹا دی۔

قائد اعظمؒ کے پاس ایک موکل آیا جس کا مقدمہ بہت لمبا چوڑا تھا اور اس کی فیس بھی بہت بنتی تھی۔ موکل نے کہا کہ اس کے پاس دس ہزار روپے نہیں۔ اس لئے قائد اعظمؒ نے مقدمہ لینے سے انکار کر دیا۔ پھر بھی موکل نے ان کو اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ کاغذات کی حد تک ہی معائنہ کریں اور باقی چھوڑ دیں۔ جب قائد اعظمؒ نے کاغذات کو دیکھنا شروع کیا تو مقدمہ بہت ہی دلچسپ نکلا اور انہوں نے ساری مسل پڑھ ڈالی۔ اور موکل کو مناسب مشورہ دے دیا۔ سب یہ خیال کرتے تھے کہ انہوں نے اس پر غیر معمولی نوازش کی ہے۔ لیکن قائد اعظمؒ کے حساب کے مطابق فیس ساڑھے تین ہزار بنتی تھی۔ اس لئے انہوں نے باقی رقم موکل کو واپس کر دی۔

(مضمون: ایک مرد خود آگاہ ہے۔ از مطلوب الحسن سید اقرا قائد اعظمؒ نمبر جون

۱۹۷۶ء)

(ماخوذ از انسائیکلو پیڈیا قائد اعظمؒ مرتبہ زاہد حسین انجم صفحہ نمبر ۳۱۶)

گاندھی جناح خط و کتابت کے سلسلے میں انسائیکلو پیڈیا قائد اعظمؒ میں لکھا گیا ہے۔ ”ہندو مسلم مسئلے کا حل تلاش کرنے کے لئے قائد اعظمؒ محمد علی جناح نے مسٹر گاندھی سے مذاکرات کئے۔ ان کے تین اہم خط یہ ہیں۔

۱۰ ستمبر ۱۹۴۴ء

محترم جناب گاندھی

ہماری کل ۹ ستمبر کی گفتگو کے حوالے سے معلوم ہوا ہے کہ آپ اپنی انفرادی حیثیت میں مجھ سے ہندو مسلم سمجھوتہ پر بات چیت کرنے کے لئے تشریف لائے ہیں۔ اور یہ کہ آپ نہ تو کانگریس یا ہندوؤں کے ایما پر آئے ہیں نہ ہی آپ کو کوئی نمائندہ حیثیت یا اختیار ہے۔ حتیٰ کہ آپ ایسا کرنے کے مجاز بھی نہیں۔ قدرتی طور پر میں نے آپ سے کہا تھا کہ فریق ثالثی کی طرف سے کوئی نمائندہ حیثیت کا حامل شخص ہونا چاہئے جس کے ساتھ میں بات چیت کر سکوں۔ اور اگر ممکن ہو تو ہندو مسلم مسئلہ پر کوئی سمجھوتہ بھی طے کر لوں۔ لیکن جو حیثیت آپ نے اختیار کی ہے اس کی پہلے کوئی مثال بھی نہیں اور پھر یہ کہ اس سے میرے راستے میں بے شمار مشکلات حائل ہو جائیں گی۔

آپ جانتے ہیں کہ میں تو مسلم ہند کے ایماء پر صرف آل انڈیا مسلم لیگ تنظیم کے صدر کی حیثیت سے ہی بات کر سکتا ہوں۔ اور اسی کام میں نمائندہ ہوں اور پھر یہ بھی کہ مجھے اس تنظیم کے

آئین اور قواعد و ضوابط کے تحت بھی بات کرنا ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ آپ کو احساس ہے اور آپ تسلیم بھی کریں گے کہ ہندو مسلم مسئلہ پر سمجھوتہ ہی سب سے بڑی اور اہم رکاوٹ ہے۔ اور جب تک ان دونوں قوموں کے نمائندے سر جوڑ کر نہیں بیٹھے کوئی ایک نمائندہ بھی کیا پیش رفت کر سکتا ہے۔

پھر بھی میں نے آپ کے سامنے مارچ ۱۹۴۰ء کی قرار داد لاہور کی وضاحت کر دی اور آپ کو ترغیب دلائی کہ کوشش کی کہ آپ اس کے اہم اور بنیادی احوال کو تسلیم کر لیں۔ لیکن آپ نے نہ صرف اس پر غور و خوض کرنے سے بھی صاف انکار کر دیا۔ بلکہ آپ نے قرار داد کی بنیاد کی ہی سرے سے پر زور مخالفت کی اور کہا۔ کہ میرے اور آپ کے درمیان ایک سمندر حائل ہے۔ میرے دریافت کرنے پر کہ پھر اس کا متبادل کیا ہے۔ آپ کی تجویز تھی کہ آپ اپنا منظور شدہ مسٹر راجہ گوپال اچاریہ کا فارمولا پیش کرتے ہیں۔ لہذا ہم نے اس پر بحث و تحقیق کی لیکن چونکہ اس کے مختلف پہلو مبہم اور غیر واضح تھے اور کچھ کی وضاحت بھی درکار تھی۔ لہذا میں نے چاہا کہ اس کا تصور آپ پر واضح کر دوں اور اس کا حقیقی مفہوم سمجھنے کی کوشش کروں اور دیکھوں کہ اس میں کیا کیا الجھنیں ہیں لہذا اسی لئے میں آپ کو فارمولا میں درج تجاویز کی تشریح اور وضاحت کی تکلیف دے رہا ہوں۔

تھوڑی دیر بحث کے بعد آپ نے درخواست کی تھی کہ میں جن نکات کی تشریح اور وضاحت چاہتا ہوں ان کو ضبط تحریر میں لا کر آپ کو اربع سال کروں اور یہ کہ آپ پیر ۱۱ ستمبر شام ساڑھے پانچ بجے ہماری دوسری ملاقات سے قبل ان کا تحریری جواب دے دیں گے۔ لہذا وہ نکات آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔

۱ = تمہید کے متعلق ہی آپ یہ فرمائیے کہ اگر میرے آپ کے درمیان کوئی سمجھوتہ طے پائے تو آپ اپنی کس حیثیت میں اس کی منظوری دینے والے فریق ہوں گے۔

۲ = شق ۱۔ جہاں تک آزاد ہندوستان کے آئین کا تعلق ہے جو اس شق میں مذکور ہے تو اولاً آپ بھی فرمائیے کہ آپ کس آئین کا حوالہ دے رہے ہیں۔ اس کی تشکیل کون کرے گا۔ اور یہ کب معرض وجود میں آئے گا۔ اس کے بعد فارمولے میں کہا گیا ہے کہ مسلم لیگ آزادی کے ہندوستانی مطالبے کی تائید کرتی ہے کہ اس سے مراد بمبئی میں ۱۹۴۲ء کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی اگست کی قرار داد میں شامل کانگریس کا مطالبہ آزادی ہے؟ اور اگر وہ نہیں تو اس شرط کی کیا اہمیت ہے۔ کیونکہ آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ مسلم لیگ نے تو نہ صرف اپنی قرار دادوں میں بلکہ اپنے بنیادی سیاسی مسلک میں بھی جو اس کے آئین میں درج ہے۔ یہ بات اچھی طرح واضح کی ہوئی تو ہے

کہ ہم تمام برصغیر کی آزادی اور خود مختاری چاہتے ہیں اور یہ بات پاکستان اور ہندوستان پر بھی لاگو ہوتی ہے۔

پھر یہ کہا گیا ہے کہ مسلم لیگ کانگریس کے ساتھ عبوری دور کے لئے عارضی ہنگامی حکومت کی تشکیل میں تعاون کرے گی۔ وہ بنیادیں اور خطوط کیا ہوں گے جن پر ایسی حکومت قائم یا تشکیل کی جائے گی۔ اگر آپ کے پاس کوئی مکمل اور واضح سکیم ہو تو ازرہ مہربانی مجھے ارسال فرمائیے۔

۳ = شق ۲۔ اس شق میں مذکورہ متن کون مقرر کرے گا اور اس کی سفارشات پر عمل درآمد کون کرے گا۔ نیز اس میں مذکورہ حتمی اکثریت سے کیا مراد ہے۔ کیا مجوزہ رائے شماری نساجی سطحوں پر کرائی جائے گی اور اگر نہیں تو یہ اور کس بنیاد پر ہوگی؟ اس بات کا فیصلہ اور تعین من کرے گا کہ یہ رائے شماری بالغ رائے دہندگی کی بنیاد پر ہوگی۔ یا کسی دیگر قابل عمل رائے دہندگی کی بنیاد پر؟ مذکورہ بالا رائے شماری کے فیصلے یا نتیجے پر عمل درآمد کون کرے گا؟ کیا صرف برکاری اضلاع کو ہی جنمیں موجودہ صوبہ بندی کے وقت حالیہ صوبوں سے الگ رکھا گیا ہے کسی ریاست میں شامل ہونے کا حق ہو گا یا ان کو بھی جو موجودہ حدود سے باہر ہیں حق حاصل ہو گا۔ وہ جس ریاست کے ساتھ چاہیں الحاق کریں۔

۴ = شق ۳۔ اس شق میں تمام فریقین سے کون مراد ہیں۔

۵ = شق ۴۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس شق میں جن باہمی معاہدوں کا ذکر کیا گیا ہے وہ کن مشینری یا ایجنسی کے توسط سے کئے جائیں گے۔ دفاع، کامرس، اطلاعات کے تحفظ، نیز دیگر ذاتی امور سے کیا مراد ہے اور یہ تحفظ کس مخالف سے ہو گا۔

۶ = شق ۵۔ ان شرائط کی پابندی اسی صورت میں لازمی ہوگی اگر برطانیہ حکومت ہند کے فیصلے اختیارات اور ذمہ داریاں منتقل کرے میں یہ بھی جاننا چاہتا ہوں کہ اقتدار کب، کسے اور کس مشینری یا ایجنسی کے توسط سے منتقل کیا جائے گا؟

اسی لمحہ تو مجھے بھی اہم نکات سونجھے ہیں۔ جن کی تشریح اور وضاحت درکار ہے امید ہے کہ آپ ان مختلف نکات کے بارے میں جن کامیں نے ترتیب وار ذکر کیا ہے، تفصیلات سے آگاہ کریں گے تاکہ آپ کی تجاویز کے بارے میں اطمینان سے کسی نتیجے پر پہنچنے سے قبل انہیں بہتر طور پر جاننے اور جانچنے کے قابل ہو سکوں۔

آپ کا مخلص

ایم۔ اے جناح

محکم دلائل سے مزین متنوع و منفرد موضوعات پر مشتمل مفت آن لائن مکتبہ

مسلم قومیت کے علیحدہ تشخص کے لئے قائد اعظمؒ نے گاندھی کو جو خطوط لکھے ان میں سے چند کا متن یہ ہے۔

۱۷ ستمبر ۱۹۴۴ء

ہم علیحدگی اور حق خود ارادیت کا حق بحیثیت ایک علیحدہ قوم کے طلب کرتے ہیں۔ نہ کہ ایک علاقائی آبادی کے اور ہم بحیثیت مسلم قوم کے یہ پیدائشی اور ناقابل تسخیر حق رکھتے ہیں۔ کہ اپنی علیحدہ آزادانہ اور خود مختار مملکت قائم کریں۔ پاکستان کا قیام کسی موجود یونین سے علیحدگی نہیں جب ہم حق خود ارادیت کا مطالبہ کرتے ہیں تو یہ مسلم قوم کا حق خود اختیاری ہے۔

۲۱ ستمبر ۱۹۴۴ء

میں یہ امر تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہوں کہ مسلمانان ہند اس ملک کے دوسرے لوگوں سے علیحدہ یا ممتاز ہیں۔ صرف کہہ دینے سے کوئی بات ثابت نہیں ہو جاتی۔ میں علیحدہ قوم کی حیثیت سے نہیں البتہ دو بھائیوں کی حیثیت سے تقسیم ہند کے مطالبہ پر غور کر سکتا ہوں۔

(انسائیکلو پیڈیا قائد اعظم: مرتبہ۔ زاہد حسین انجم، صفحہ نمبر ۶۰۶-۶۰۷)

ان خطوط کے مطالعے سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حضرت قائد اعظمؒ نے مسلمانان ہند کے بنیادی سیاسی نظریات و مقاصد کو باور کرانے کے لئے کتنا زور لگایا، انہوں نے چوکھی جنگ لڑ کر یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں کو خدا تعالیٰ نے بے پناہ صلاحیتوں اور قوتوں سے ہمکنار کیا ہے۔ قائد اعظمؒ ان خطوط سے جو مسٹر گاندھی کے نام لکھے جاتے رہے، ایک مکمل تحریک پاکستان کی تاریخی دستاویزات کی حیثیت رکھتے ہیں مگر کمال ہے مسٹر گاندھی کا، جنہوں نے بڑی ڈھٹائی کے ساتھ حضرت قائد اعظمؒ کے ہر استدلال اور ہر منطق کو اپنی ”مہاتمایت“ کی نذر کر دیا۔

گاندھی جی کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

”۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو قائد اعظمؒ نے گاندھی کے قتل پر یہ بیان دیا کہ گاندھی جی کا

قتل بھارت کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔ وہ ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے۔ ان کا نام موہن داس کرم چند تھا۔ انہوں نے لندن میں تعلیم حاصل کی۔ ۱۸۸۹ء میں برسٹری کا امتحان پاس کر کے افریقہ چلے گئے اور وہاں سات سال (۱۸۹۳ء - ۱۹۰۰ء) تک وکالت کے پیشے سے منسلک رہے۔ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے مغربی لباس ترک کر دیا اور کھدر کا سادہ تہم، کرتا اور پگڑی پہننا شروع کر دی پھر لنگوٹ پر آ گئے۔ ۱۹۱۵ء میں ہندوستان چلے گئے۔ اور برصغیر کی آزادی کے لئے سرگرم عمل ہو گئے ۱۹۱۹ء میں انہوں نے سبیتہ گرہ تحریک کا آغاز کیا مختلف موقعوں پر ملکی قوانین کی خلاف ورزی پر قید ہوئے۔

دو مرتبہ اکیس اکیس روز کا پرت بھی رکھا۔ ۱۹۳۱ء میں ہندوستان کی گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ ۱۹۳۲ء میں ہندوستان چھوڑ دو کی تحریک کا آغاز کیا۔ آزادی ہند کے بعد ہندوستانوں کی فلاح و بہبود میں مصروف ہو گئے۔

۳۰ جنوری ۱۹۳۸ء کو انہیں گاڑ سے نامی ایک مرہٹہ ہندو نے گولی مار کر ہلاک کر دیا۔ اپنے خیالات کے اظہار کے لئے کئی کتابیں لکھیں اپنی سوانح بھی لکھی۔

گاندھی قائد اعظمؒ کی نظر میں

گاندھی کا مقام اپنی قوم کے نزدیک جس قدر اہمیت کا حامل تھا وہ کسی سے پوشیدہ نہیں حتیٰ کہ وہ انہیں اپنا اوتار مانتے تھے۔ لیکن قائد اعظمؒ کی نظر میں گاندھی کوئی قابل قدر شخصیت نہ تھی۔ مثلاً قائد اعظمؒ نے ایک مرتبہ گاندھی کے بارے میں فرمایا۔

”ہمیں جس حریف سے پالا پڑا ہے وہ گر گٹ کی طرح اپنا رنگ بدلتا رہتا ہے۔ جب ان کا مفید مطلب نہیں ہوتا وہ کہہ دیتے ہیں کہ وہ کسی کے نمائندے نہیں اور جب ضرورت ہوتی ہے تو سارے ہندوستان کے واحد نمائندہ بن جاتے ہیں۔ ان کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ زبان پر لاتے ہیں جب اور عربوں سے کام نہیں چلتا تو مرت برت رکھ لیتے ہیں۔ چنانچہ ایسے شخص سے ہم کس طرح بات کر سکتے ہیں۔ وہ تو ایک چیتانی کا معمہ ہے۔“

(انسائیکلو پیڈیا قائد اعظمؒ — مرتبہ: زاہد حسین انجم، صفحہ نمبر ۶۰۸ — ۶۰۷)

”ہندوؤں کے بے شمار مذہبی فرقے ہیں۔ شوا، وشنو کے پجاری، کبیر پن্থی، رادھا سوامی اور گاکے پجاری، سمت نامی برہمن سماج، آریہ سماج، فطرت کے پجاری، ہندوؤں میں بے شمار ذاتیں اور گوتیں بھی ہیں۔ ان میں ایک ذات دوسری ذات سے شادی نہیں کرتی۔ بلکہ بعض تو دوسری ذات کے ہاتھ کا پھو ہوا بھی نہیں کھاتے۔ مگر آج کل کے ہندوؤں میں مذہبی جوش تو مر گیا ہے۔ مگر وہ اپنے سب دیوتاؤں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ ان کی کچھ زیادہ پرواہ نہیں کرتا۔ ہاں سوسائٹی کے لحاظ سے جو فرقے مثلاً اگرہ سماج وغیرہ پیدا ہو گئے ہیں۔ ان کا اس وز زیادہ خیال ہے۔ اس کا مذہب سیاسی اور سماجی رہ گیا ہے، روحانی نہیں۔“

(آزاد قوم کی تعمیر، پاکستان، مصنفہ ڈاکٹر محمد شجاع ناموس صفحہ نمبر ۴۹)

مہاتما گاندھی اس ہندو ازم کے نمائندے اور علمبردار ہیں جس میں آج تک وہ انسانی حقائق اور تاریخ انسانی کے خوشگوار پہلوؤں کو اجاگر کر سکے۔ جس میں انسان کو انسان کی حد تک پہنچانا جاتا ہو۔ مہاتما گاندھی شاید اس تاریخی فلسفے کو سمجھنے سے قاصر تھے کہ ہندوستان تو تاریخ کے

کسی دور یا کسی موڑ پر بھی ایک متحدہ ہندوستان کبھی نہ رہا۔ چنانچہ آرتھیانے تھخیرنے لکھا ہے۔ اور پھر حیرت ہے کہ یہ کتاب جو انہوں نے تحریر کی، وہ جنوبی ہندوستان کے کالجوں کے نصاب میں شامل رہی۔ جس کا ذکر ذیل میں آئے گا)

”ہندوستان کی شہنشاہیاں اس طرز کی رہی ہیں، جن میں ایک فرماں روا حاکم اعلیٰ ہوتا ہے اور بحیثیت مجموعی ہندوستان کی وحدت دورِ جدید سے قبل نہ تو سیاسی تھی اور نہ انتظامی۔ ذاتِ گوت کا نظام سماجی وحدت کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ نسلی اور انسانی اختلاف سے، اگرچہ ان کو بڑھا چڑھا کر ظاہر کیا جاتا ہے۔ مگر ہیں وہ حقیقت، مذاہب کا وہ جنگل جس کا نام ”ہندومت“ رکھا ہوا ہے۔ کسی بڑی حد تک، ایک مرکز پر کھینچ کر لانے والی قوت کا کام نہیں دیتی۔“

(A Political and Cultural History of India by R.Santhianathier.P-11)

ڈاکٹر محمد شجاع ناموس مزید تحریر کرتے ہیں۔ ”گاندھی جی کانگریس کے گرو دیویں۔ ہر فرقہ وارانہ مجلس مشاورت میں کہتے تو وہ یوں ہیں کہ میں کانگریس کا نمائندہ بن کر نہیں آیا ہوں۔ بلکہ اپنی شخصی حیثیت میں آیا ہوں۔ البتہ کانگریس کو مشورہ دوں گا۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی میرے مشورے کو مانے یا نہ مانے۔ یہ کس قدر سیاسی فریب ہے۔ ایک جماعت کی طرف سے بحث میں حصہ لینے کے لئے جانا اور اس کا نمائندہ ہونے سے انکار کرنا۔ دوسرے کے قول کو متنبہ کرنا اور خود آزاد رہنا۔ تاہم کانگریس کا پتہ پتہ اور ذرہ ذرہ گرو دیو کے اشارے سے بلاتا ہے۔ کانگریس کی پالیسی ہندوستان کی قومی زبان کے متعلق دریافت کرنی ہو تو گرو دیو کی پالیسی معلوم کرنی چاہئے۔ میں اگر اپنی زبان سے کچھ کموں تو امکان ہے سوئے اوب سمجھا۔ اس لئے مہاتما جی کے الفاظ میں ان کی پالیسی ملاحظہ کیجئے۔

”ہریجن“ مہاتما گاندھی کا پرچہ ہے جو انگریزی میں چھپتا ہے۔ اس میں مہاتما جی نے اردو ہندی اور ہندوستان کی قومی زبان کے متعلق وقتاً فوقتاً اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ جو مضامین جولائی ۱۹۲۷ء اور جولائی ۱۹۳۷ء کے درمیانی عرصے میں چھپے ان کو ایک کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا ہے۔ اس کا نام ہے۔

‘Our Language Problem.’

By: Mahatma Gandhi

اس کتاب میں سے چند اقتباس پیش کئے جاتے ہیں۔ ربط قائم رکھنے کے لئے میں نے بیچ میں کچھ الفاظ شامل کر دیئے ہیں۔ گاندھی جی کہتے ہیں۔ (یہ ترجمہ ہے) ”جب سے میں نے پبلک

لائف میں قدم رکھا ہے (صفحہ ۲۷) میرا جی عقیدہ چاہا ہے اور میں نے انہی کا ہمیشہ اعلان کیا ہے کہ میری پشتہ رائے میں انگریزی نہ توکل ہند زبان بن سکتی ہے۔ اور نہ ہونی چاہئے۔ کل ہندوستان زبان صرف ہندی (یعنی ہندوستانی) ہو سکتی ہے۔ وہ ہی زبان جس کو شمالی ہندوستان کے ہندو مسلمان لاکھوں انسان بولتے ہیں۔ ”یہ تو ابتدائی انتخابات کی بات ہے۔ چونکہ اس وقت یہی زبان کل ہند زبان بننے کی اہلیت رکھتی ہے یہی اردو زبان ہے جو دہلی لکھنؤ میں مروج ہے (فی الحال ہم اس کو دیوناگری اور فارسی دونوں طرح کے رسم الخط میں لکھا کریں گے۔ مگر آپ کہتے ہیں کہ ایک زبان کے لئے دو رسم الخط کیسے ہو سکتے ہیں۔ یہ تو اپنے کئے کو خود ہی بالکل باطل کرتا ہے۔“ میں جانتا ہوں (صفحہ ۲۸) کہ میں تناقض بات پیش کر رہا ہوں۔ جب میں ایک ہی زبان کے لئے دیوناگری اور اردو رسم الخط کو روارکھتا ہوں۔ مگر میرا یہ تناقض بالکل احقانہ نہیں ہے۔ موجودہ زمانے میں ہندو مسلمانوں میں بے اتفاقی ہے۔ تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمانوں کے لئے عقلمندی اسی میں ہے کہ وہ ایک دوسرے کا احترام کریں اور جس حد تک ممکن ہو سکے بردباری اور رواداری سے کام لیں۔ اس لئے دیوناگری یا اردو کسی رسم الخط کے انتخاب کا اختیار ہے۔ ”مگر ہندو جاتی کے دھرماتما جو اس وقت چراغ پا ہو رہے ہیں ان کو معلوم نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ کتنا بھی انسان رواداری سے کام لے۔“ (لیکن (صفحہ ۱۵) جب قوم میں وسعت پیدا ہوگی۔ تو لازمی ہے کہ ہندو جو صرف سنسکرت جانتے ہیں۔ وہ سنسکرت کے الفاظ کا خاص طریقے سے استعمال کریں گے۔ اگرچہ دونوں ایک ہی زبان لکھیں اور مخصوص رغبت یا نفرت نہ بھی رکھتے ہوں۔ تو بھی یہی ہو گا۔“ ظاہر ہے کہ ہندو دیوناگری رسم الخط سیکھیں گے۔ اور سنسکرت کے الفاظ زیادہ استعمال کریں گے۔ بھارت دیش میں ان کی تعداد بھی مسلمانوں کی نسبت بہت زیادہ ہے (مسلمان ہیں ۲۵ فیصدی) ”آخر کار (صفحہ نمبر ۵۹) اس میں سے جو رسم الخط لوگ زیادہ پسند کریں گے۔ وہی زیادہ وقعت حاصل کرے گا۔“ اس کا نتیجہ ظاہر ہے ”زبان کی جو شکل بھی (صفحہ نمبر ۵۹) عوام میں ہر دلعزیز ہوگی۔ اور جس کو وہ بہتر طریقے سے سمجھ سکیں گے۔ خواہ وہ ہندو ہوں یا مسلمان وہی کل ہند زبان بنے گی۔“ جب ہندوؤں کی تعداد ہندوستان میں زیادہ ہے۔ تو تجارتی کے حکم کے مطابق یہ ہندوؤں کی زبان ہوگی۔ جو کل ہند زبان بنے گی۔ اور وہ سنسکرت سے معمور ہندی ہوگی۔ یہ زبان ہندوستان کے تمام رہنے والوں کو سیکھنی پڑے گی۔

اس سیاسی پروگرام کے پیش نظر میں نے (یعنی گاندھی جی) بھی کام شروع کر دیا ہے۔ اور دیوناگری رسم الخط کو فروغ دینے کی تدابیر اختیار کی ہیں۔ ”بلاشبہ (صفحہ نمبر ۱۶) ایک دیوناگری تحریک موجود ہے اور میں بدل و جان اس کا حلیف بن گیا ہوں۔ غرض یہ ہے کہ دیوناگری کو ان

سب زبانوں کا جو مختلف صوبوں میں بولی جاتی ہیں۔ مشترکہ رسم الخط بنا دیا جائے۔ خاص طور پر ان صوبوں میں جہاں ایسی زبانیں بولی جاتی ہیں جن میں سنسکرت الفاظ کی تعداد زیادہ ہے۔ ”اب سب باتوں کا نتیجہ یہ ہو گا۔ کہ ”آخر کار (صفحہ نمبر ۶) جب ہمارے دل ایک ہو جائیں گے۔ اور ہم سب اپنے اپنے صوبوں پر نہیں بلکہ اس بات پر فخر کریں گے جب ہم یہ سمجھ لیں گے کہ تمام مذاہب ایک منبع سے نکلے ہیں۔ اور ان کی پیروی اسی خیال سے کریں گے۔ جس طرح سے کہ ہم ایک درخت کے مختلف پھلوں سے محفوظ ہوتے ہیں۔ تو ہم ایک مشترکہ زبان تک پہنچ جائیں گے۔ جس کا رسم الخط تمام ہندوستان میں ایک ہو گا۔ ہاں مگر ہم صوبہ جاتی زبانوں کو صوبائی استعمال کے لئے قائم رکھیں گے۔“ اس وقت تو مسلمان کے دل میں مذہبی جوش اور قوت کا گھمبڑ ہے۔ جب وہ ہندو میجاری کے راج میں کچھ عرصہ تک پس کر مہین ہو جائے گا۔ اس کے خیالات ہندو تہذیب میں رنگے جائیں گے۔ تو وہ خود بخود ہمارا ہم خیال ہو جائے گا۔ اس وقت رومن رسم الخط بھی میدان میں دعوے دار ہے۔ مگر ”رومن رسم الخط ہندوستان کا مشترکہ رسم الخط نہ تو بن سکتا ہے (صفحہ نمبر ۳۶) اور نہ ہونا چاہئے۔ مقابلہ تو صرف فارسی اور دیوناگری خطوں کے درمیان ہے۔ اس بات کو بھی ہم بحث میں نہیں لاتے کہ اس میں کتنی ذاتی خوبیاں موجود ہیں۔ لیکن دیوناگری تمام ہندوستان کا مشترکہ رسم الخط اس لئے ہونا چاہئے کہ صوبہ جاتی رسم الخطوں سے بیشتر کا منہ دیوناگری ہے۔ اس کے علاوہ سیکھنے میں بہ نسبت میں بہت ہی آسان ہے۔“ اب میرے کچھ کہنے کی کیا ضرورت ہے معاملہ آپ کے سامنے ہے۔“

(آزاد قوم کی تعمیر اور پاکستان - مصنفہ ڈاکٹر محمد شجاع ناموس صفحہ نمبر ۸۲ - ۸۰)

یہ مسلم الثبوت حقیقت ہے کہ اسلامیان ہند کے خلاف ہندو نے ہر مرحلے ہر موڑ اور ہر انداز سے اپنی کم ظرفی، تنگ دلی، معاندانہ رویئے اور زہریلے پراپیگنڈے کا اظہار تختی سے جاری رکھا۔ بڑے بڑے جید سیاست دان اور زعمائے کرام پہلے کانگریس ہی کے ممبر رہے۔ لیکن ہندو کے روایتی تعصب اور گھٹیا روشوں کے باعث کانگریس سے علیحدگی اختیار کرتے چلے گئے لہذا گاندھی سے مسلمانوں کے حق میں بہتر سلوک کرنے کی کیا توقع کی جاسکتی تھی۔ انہوں نے جس طرح بڑی ڈھٹائی کے ساتھ ہندی کو پورے ہندوستان کی زبان قرار دیا اور تمام طبقوں سے اسے تسلیم کرانے کی ان تھک کوشش کی وہ ساری کیفیات پہلے کے صفحات میں درج کی جا چکی ہیں۔ چنانچہ حضرت قائد اعظمؒ جو ہندو کی اجتماعی نفسیات کے ماہر انسان تھے، ان کی سیاسی جمناسٹک کو بڑی اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انہوں نے مسلمانان ہند کو کسی بھی محاذ پر شکست و ریخت سے ہمکنار نہ ہونے دیا۔ چنانچہ انہوں نے اردو کو ہندی کے مقابلے میں بڑے جوش و خروش سے پاکستان کی سرکاری زبان

ہونے کا اعلان فرمایا۔

ڈاکٹر عبدالحق فرماتے ہیں۔ ”مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں جو دہلی میں ہو رہا تھا۔ سر فیروز خان نون نے اپنی تقریر انگریزی زبان میں شروع کی، تو ہر طرف سے شور و غل ہوا۔ ”اردو، اردو،“ اس سے مجبور ہو کر انہوں نے کچھ جملے اردو میں ارشاد فرمائے اور اس کے بعد پھر اپنی محبوب زبان انگریزی بولنے لگے اس پر پھر ”اردو، اردو“ کا شور و غل ہوا۔ تب جا کر آپ نے جل کر فرمایا کہ مسٹر جنلج بھی تو انگریزی میں تقریر کرتے ہیں۔ یہ سن کر قائد اعظمؒ اپنی کرسی پر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور صریح و صاف الفاظ میں فرمایا کہ ”سرفراز خان نون نے میرے پیچھے پناہ لی ہے۔ لہذا میں اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کی زبان اردو ہوگی۔“

(نقوش قائد اعظمؒ۔۔۔ مرتبہ پروفیسر رحیم بخش شاہین صفحہ نمبر ۱۱)

ایک اور جگہ پر اردو کے ضمن میں ڈاکٹر عبدالحق فرماتے ہیں۔ ”عربک کالج کے طلبہ نے ان سے درخواست کی کہ وہ اس وقت کے معاملات پر تقریر فرمائیں۔ انہوں نے منظور فرمایا۔ تقریر سے قبل شب کے کھانے کی بھی دعوت دی۔ جس میں چند اور صاحبوں کو بھی مدعو کیا۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ کھانے کے بعد مجھ سے فرمانے لگے ”آپ کو معلوم ہے کہ سب سے پہلے میں نے اردو میں کب اور کہاں تقریر کی۔“ میں نے لاعلمی ظاہر کی تو فرمایا ”کئی سال ہوئے بنگال کے مقام پر گیا (مجھے اس کا نام یاد نہیں رہا۔ غالباً یہ جملہ انتخابات کے سلسلے میں تھا) تو دیکھا کہ کئی ہزار آدمی جمع ہیں۔ اس قدر جمع کی توقع نہ تھی۔ میں نے سر عزیز الحق سے جو اس وقت میرے ہمراہ تھے۔ پوچھا کہ اس مجمع میں کتنے لوگ انگریزی سمجھتے ہوں گے؟ انہوں نے کہا کم و بیش پانچ سو۔ تب میں نے کہا اردو جاننے والے کتنے ہوں گے! انہوں نے کہا تقریباً ڈیڑھ ہزار۔ اس کے بعد سر عزیز الحق نے کہا آپ انگریزی میں تقریر فرمائیے۔ میں اس کا ترجمہ بنگالی میں سنا دوں گا۔ لیکن میں نے ان کا مشورہ نہ مانا اور اردو میں تقریر کی۔ یہ میری پہلی اردو تقریر تھی۔“

اس کے بعد قائد اعظمؒ ہنس کر فرمانے لگے۔ (My Urdu is Tongawala

Urdu.) (میری اردو ٹانگے والے کی اردو ہے)

سراج نظامی (مرحوم) اپنے مضمون میں تحریر کرتے ہیں۔ ”۱۹۰۶ء میں آپ کانگریس کے اجلاس کلکتہ میں شریک ہوئے۔ اس کے صدر دادا بھائی نوروجی تھے۔ آپ ان دنوں ان کے پرائیویٹ سیکرٹری تھے۔ اس اجلاس میں آپ نے پہلی تقریر فرمائی۔ حسن اتفاق سے یہ تقریر مسلمانوں کے قانون وقف الاولاد کے متعلق تھی۔ سامعین آپ کی تقریر سے متاثر ہوئے اور انہیں

پتہ چلا کہ برصغیر کے آسمان سیاست پر ایک نیا ستارہ چمکا ہے۔ اسی سال مسلمانوں نے بھی اپنی سیاسی بیداری کا ثبوت دیا۔ اور مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔

۱۹۱۰ء میں آپ برطانوی ہند کی امپیریل کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ اس وقت تک آپ مسلم لیگ سے ہمدردی رکھنے کے باوجود اس سے الگ رہے۔ آپ کانگریس کے سرگرم رکن اور حامی تھے۔ ۱۹۱۳ء میں مولانا محمد علی جوہر اور سید وزیر حسن نے آپ کو مسلم لیگ میں شمولیت پر آمادہ کر لیا۔ آپ اس میں شامل تو ہو گئے۔ لیکن دلی رجحان کانگریس کی طرف رہا۔ ۱۹۱۶ء میں آپ نے کانگریس اور مسلم لیگ کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی مخلصانہ کوشش کی۔ جس کا نتیجہ بیٹاق لکھنؤ کی صورت میں نمودار ہوا۔ آپ ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور آپ کو اس اتحاد کا علمبردار سمجھا جاتا تھا۔ کانگریس نے ان کی خدمات کے پیش نظر بمبئی میں ایک ہال تعمیر کیا۔

جب پہلی جنگ عظیم ختم ہوئی تو برطانوی حکومت اپنے دعوؤں سے منحرف ہو گئی اس نے رولٹ ایکٹ جیسا منشردانہ قانون نافذ کر کے آزادی تحریر و تقریر اور سیاسی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کرنے کی کوشش کی سارے برصغیر میں ان کے خلاف تحریک شروع ہو گئی۔ ہر بڑے شہر میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ کئی ہنگامہ خدائنگریزی گولیوں کا نشانہ بنے۔ اسی زمانے میں مسٹر گاندھی جنوبی افریقہ میں سینئر گروہ کی کامیاب تحریک چلا کر برصغیر آئے اور رولٹ ایکٹ کے خلاف تحریک کے کرتا دھرتا بن گئے۔ ہندوؤں نے انہیں مساتما کا لقب دیا۔ اکثر ہندو مسلم لیڈر تحریک ترک موالات میں شریک ہو گئے۔ لیکن قائد اعظمؒ اس سے الگ تھلگ رہے اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے اپنی خداداد قابلیت سے معلوم کر لیا تھا کہ یہ تحریک آخر کار ناکام ہو کر رہے گی۔ آپ نے اس کی مخالفت کی۔ لیکن آپ کی شنوائی نہ ہوئی اور ۱۹۲۰ء میں کانگریس سے الگ ہو گئے۔ آپ کیوں الگ ہوئے اس کے متعلق آپ نے فروری ۱۹۲۱ء میں فرمایا۔

”میرے بہت سے دوستوں اور رفیقوں نے پوچھا ہے کہ میں سیاسیات کے اس نازک ترین دور میں خاموش کیوں ہوں۔“ بلاشبہ موجودہ صورت حال دشواریوں اور خطروں سے لبریز ہے۔ ایک طرف حکومت کا وہ سفاکانہ طرز عمل ہے۔ جس نے قومی وقار کو مجروح کیا ہے۔ لیکن دوسری طرف میں یہ کہنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ مسٹر گاندھی نے جن کی میں عزت کرتا ہوں۔ جو پروگرام اختیار کیا ہے وہ قوم کو غلط راستے پر لئے جا رہا ہے۔“

آپ کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی اور مسٹر گاندھی کی یہ تحریک بری طرح ناکام ہو گئی۔ سب سے زیادہ نقصان مسلمانوں کو پہنچا۔ جب ہندوؤں کی طرف سے شدہی اور سنگسٹن

اور ہندی زبان کی تحریکیں چلائی گئیں تو ہر بڑے شہر میں فرقہ وارانہ فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ ہندوؤں کے دلی ارادے واضح طور پر عیاں ہونے لگے۔ قائد اعظمؒ ناامید ہو کر ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۶ء تک خاموشی سے سیاسی حالات کا جائزہ لیتے رہے۔ ۱۹۳۰ء میں آپ لندن کی دوسری گول میز کانفرنس میں شریک ہوئے لیکن مسٹر گاندھی نے اس میں شرکت نہ کی۔ البتہ تیسری گول میز کانفرنس میں انہوں نے شرکت کی۔ لندن میں انتہائی کوشش ہوئی کہ ہندو مسلم مسئلہ کا کوئی قابل قبول حل نکل آئے لیکن ہندوؤں کی ہٹ دھرمی نے اسے ناکام بنا دیا۔

اسی گول میز کانفرنس کے مسلم مندوبین میں حضرت علامہ اقبالؒ بھی شامل تھے۔ جنہوں نے ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد میں اپنے تاریخی خطبے میں ایک متحدہ اسلامی ریاست کے قیام کی نشاندہی کی تھی۔ آپ سے قائد اعظمؒ نے کئی ملاقاتیں کیں اور ان کے سامنے اپنے نقطہ نظر کی مزید وضاحت کی۔ لیکن ان دنوں قائد اعظمؒ برصغیر کی سیاسیات سے اتنے بیزار ہو چکے تھے کہ آپ نے واپس آنے کی بجائے انگلستان میں مستقل سکونت اختیار کر کے دیہی پر یکش کرنے کو ترجیح دی۔ چنانچہ آپ پر پوی کو نسل میں پر یکش کرنے لگے۔ بات یہ تھی کہ آپ نے سالہا سال سے دل سے یہ کوشش کی تھی کہ ہندو مسلم اتحاد ہو جائے اور ان کے باہمی مسائل باعزت طریق سے حل ہو جائیں لیکن ہندو کی سیاست نے ان کی کوئی پیش نہ چلنے دی۔ اس کے متعلق انہوں نے فرمایا۔ ”مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں نہ تو ہندوستان کی کوئی مدد کر سکتا ہوں اور نہ ہی ہندو کی ذہنیت بدل سکتا ہوں اور نہ مسلمانوں کو ان کی نازک حالت کا یقین دلا سکتا ہوں۔ یہ احساس بچاگرگی اس قدر بڑھا کہ میں لندن میں اقامت گزین ہو کر رہ گیا۔“

(نقوش قائد اعظمؒ — مضمون قائد اعظمؒ تحریر سراج نظامی درم صفحہ نمبر ۵)

حضرت قائد اعظمؒ نے برطانوی قانون کی کبھی اپنے سیاسی مطلب اور سستی شہرت حاصل کرنے کے لئے خلاف ورزی نہ کی تھی۔ بحیثیت وکیل انہوں نے قانون کی ہمیشہ پاسداری کی۔ اور اسلامیان ہند کو ہر موقع پر غیر قانونی اور غیر آئینی اقدام سے ختمی سے منع فرماتے تھے۔ مگر ان کے برعکس گاندھی نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ غیر قانونی اور غیر آئینی اقدامات سے سیاست کی دوکان چمکائی جائے۔ اور جیل کی سیر کی جائے، گاندھی کئی مرتبہ جیل گئے، اور جیل کی سزا بھگتتے کو اعلیٰ ترین سیاسی منصب تصور کرتے تھے۔ مگر حضرت قائد اعظمؒ کی تمام سیاسی زندگی کا تجربہ یہ کیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ لمحہ بھر کے لئے بھی جیل نہ گئے اور نہ کسی غیر سیاسی فعل کا ارتکاب کیا۔

”مہاتما گاندھی اینڈ انڈیا ز سٹرگل فار سورا ج“ کے مصنف تحریر کرتے ہیں۔

”گاندھی جی اور ان کے ساتھی ڈنڈی پنچے، یہ ۱۵ اپریل کی بات ہے۔ یہاں انہوں نے

رات پرارتھنا کی اور کچھ نہ کھایا پیا۔ صبح ۶ بجے کے وقت پرارتھنا کے بعد گاندھی جی اپنے ۸۴ ساتھیوں سمیت سمندر میں نہانے کے لئے گئے۔ ان کے ہمراہ بہت سا جلوس افراد کا اور بھی ہوا۔ چنانچہ مہاتما گاندھی آہستہ آہستہ چل رہے تھے۔ اور پانی میں داخل ہو رہے تھے۔ لوگوں نے پر جوش نعرے لگائے اور ”مہاتما جی کی جے“ کے نعرے لگائے۔ ۳۰ - ۸ بجے انہوں نے سالٹ لاء کی خلاف ورزی کی۔ اور نمک اٹھایا۔ اس منظر کا بہت سے لوگوں نے نظارہ کیا۔ سالٹ لاء کی خلاف ورزی کے اس انداز سے انہوں نے ایک بیان جاری کیا، کہ جو کوئی بھی سالٹ لاء کی خلاف ورزی کرے جہاں کہیں بھی چاہے اور جب چاہے نمک تیار کر سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مہاتما گاندھی کے اس اقدام سے ہزاروں اس طرح کے غیر قانونی اقدامات کئے گئے۔ اور لوگ غیر قانونی نمک بیچنے اور تیار کرنے لگ پڑے۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں بے شمار افراد گرفتار ہوئے۔ بلکہ یہاں تک کہ کانگریس کے بہت سے ممبران بھی شامل تھے۔ جنہوں نے ایسے مظاہروں کی حوصلہ افزائی کی تھی۔۔۔۔

مہاتما گاندھی اس ضمن میں حکومت کے خلاف زہریلا پروپیگنڈا بھی کر رہے تھے۔ چنانچہ انہوں نے صوبہ گجرات کا دورہ کیا اور اچھوتوں کے خلاف ایک مہم بھی جاری رکھی۔ یہ بیان بھی دیتے رہے کہ ”کھدی اور چرخہ“ کو مقبول کیا جائے۔ انہوں نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ حکومت کے سالٹ ورکس کو برباد کر دیں گے۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ حکومت نے مہاتما گاندھی پر پابندیاں لگا دیں۔ بالآخر مہاتما گاندھی کو ۴ مئی کو ان کے ایک کیمپ کراڈی میں ۱۸۲۷ء کے ریگولیشن ۲۵ کے تحت گرفتار کر لیا گیا۔“

(Mahatama Gandhi and Indias Struggle for Swaraj)

By: B. Sengupta and R. Chaudhri. P31-32

• گاندھی ایک طرف تو برطانوی حکومت اور وائسرائے کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے تو دوسری طرف جب بھی ایسا موقع میسر آتا جس میں انہیں کوئی مطلب براری کا مسئلہ درپیش ہوتا تو انہیں اپنا محسن اور ہمدرد تصور کرتے۔ گاندھی کہتے ہیں۔

اگر یہ میری بنیادی پوزیشن تصور کی جائے کہ آپ برطانوی وزراء اور برطانوی لوگ اگر آپ چاہتے ہیں کہ ہندوستان ترقی کرے۔ تو تمام حکومتی اختیارات مجھے تفویض کر دیئے جائیں۔ اور تمام فوج کو ہمارے ماتحت کر دیا جائے۔ یہ مجھے معلوم ہے کہ آرمی میرے احکام پر عمل پیرا نہیں ہو گی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ برطانوی کمانڈر انچیف میرے حکم کی تعمیل نہیں کرے گا۔ نہ ہی سکھ اور نہ ہی مغرور راجپوت دل سے میرے حکم کی تعمیل کریں گے۔ لیکن میں یہ یقین سے کہہ سکتا ہوں

کہ یہ سب کچھ میں برطانوی عوام کی مرضی اور منشا سے کر سکتا ہوں۔ اور انہیں ان سپاہیوں کو سبق سکھانے کے لئے موجود رہنا چاہئے۔ تاکہ انہیں یہ احساس ہو کہ وہ اپنے ہی ملک کی خدمت کر رہے ہیں، اگر وہ اس طرح کرنا چاہیں۔ برطانوی افواج کو بھی یہ کہا جائے کہ انہیں ہندوستان میں برطانوی مفادات و مقاصد کی نگرانی ہی نہیں کرنی چاہئے بلکہ ہندوستان کو بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنے کی سعی کرنی چاہئے جس طرح وہ اپنے ملک برطانیہ کی حفاظت کرتے ہیں مہاتما گاندھی نے کہا ”یہ ہے میرا خواب“ — ”اور مجھے معلوم ہے کہ میرا خواب یہاں پورا نہیں ہو سکتا۔ یہی کچھ ہے جو میں محسوس کر رہا ہوں، میرے حواس میری گواہی دے رہے ہیں کہ میں یہ خواب پورا ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ اس لئے کہ جو کانفرنس کی کارروائی ہو رہی ہے۔ میں اس سے مطمئن نہیں ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ اس خواب کی تکمیل کی آرزو رکھوں اور یہ آرزو میری زندگی کے آخری لمحے تک رہے گی۔ میں برطانوی حکومت اور برطانوی عوام کو کس طرح باور کراؤں کہ جس طرح میں ایسی آرزو اور ارادہ رکھتا ہوں ایسا ہی ان کو بھی خیال کرنا ہو گا“ —

Mahatma Gandhi and Indias Struggle for Swaraj By Sena
gupta and R.Chaudhri.P163

مندرجہ بالا حوالوں سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی کے علمبردار، مہاتما گاندھی کی سیاست کس قدر لگی لپٹی، دوغلی اور سہ چہنی تھی۔ ایک طرف تو انگریزوں کو باہر نکالنے کے دعوے دار تھے اور دوسری طرف انہی کو ہندوستان کے مفادات کا نگران بھی تصور کرتے تھے۔

مہاتما گاندھی نے گول میز کانفرنس کے اختتامی اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے جن امور کی طرف ممبران کی توجہ منعطف کرائی ان میں قابل ذکر بات کانگریس کا ایک بین الاقوامی سیاسی جماعت ہونے کا دعویٰ کیا گیا۔ مہاتما گاندھی فرماتے ہیں۔ ”کہ اس کانفرنس میں جتنی بھی پارٹیاں شامل ہیں۔ یہ سبھی اپنے اپنے فرقہ وارانہ جماعتوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔ کانگریس واحد ایسی سیاسی جماعت ہے جو تمام ہندوستان کی نمائندہ جماعت ہے اور ان کے مفادات و مقاصد کی واحد نگران جماعت — یہ کوئی طبقاتی تنظیم نہیں ہے، اس جماعت نے ہمیشہ طبقاتی احوال اور تنظیم کی مخالفت کی ہے۔ کانگریس میں نسل، زبان اور عقیدے کا کوئی تعلق نہیں، کانگریس کا پلیٹ فارم بین الاقوامی پلیٹ فارم ہے۔ اور دنیا میں ایسی تنظیم نہیں جو اس طرح کا دعویٰ کر سکے۔“ —

(مذکورہ بالا کتاب کا صفحہ نمبر ۲۰۱)

تحریک پاکستان کے دلدوز اور دلخراش حالات و واقعات ہمارے سامنے ہیں۔ کہ کس طرح

انڈین نیشنل کانگریس نے دوسرے طبقات، دوسری جماعتوں اور خصوصاً مسلمانان ہند پر جو مظالم ڈھائے۔ روز روشن کی طرح واضح ہیں۔ مہاتما گاندھی کی سیاسی جہننا شک بر موڑ پر اپنا جلوہ دکھاتی نظر آتی ہے۔ ان کے سیاسی بیانات، قومی تقاریر اور ان کے نظریات و تصورات وقت کی مصلحتوں کے محتاج رہے، لیکن حضرت قائد اعظمؒ کے بارے میں آج تک کوئی دانشور، کوئی مفکر، کوئی سیاستدان، اپنا یا پرایا یہ نہ کہہ سکا کہ انہوں نے کبھی مصلحتانہ گفتگو کی ہو یا بیان دیا ہو، انہوں نے جس طرح اپنے نجی سیاسی بیانات میں برطانوی حکومت کو اپنی تنقید کا نشانہ بنایا اسی طرح جلسہ عام میں بھی اظہار کیا۔ اگر بمبئی میں یا دہلی میں کوئی بیان دیا۔ تو ایسا کبھی ممکن نہ ہوا کہ اسے انگلستان میں جا کر بدل دیا ہو۔۔۔۔۔ یہ کمال فقط مہاتما گاندھی کو ہی حاصل ہے۔

ایچ ایم سیر دوائی لکھتے ہیں۔ ”گاندھی ۳۰ جنوری ۱۹۴۸ء کو اپنے قتل تک کانگریس کے افق پر چھائے رہے۔ ہندوستان کے عوام کی جتنی عقیدت ان کے حصے میں آئی کسی اور لیڈر کو میسر نہ آ سکی۔ ان کے سادہ انداز زندگی نے انہیں پاکیزہ ہستی کا مرتبہ دے دیا۔ ان کے الفاظ ہندو دھرم کا حصہ لگتے تھے اور عوام کے دلوں میں اتر جاتے تھے۔ اس لئے ان کی کامیابیوں کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ ویسے بھی یہ معلوم کرنا کہ ان کی شخصیت پر کب فقر اور کب سیاست حاوی ہوتی تھی، آسان کام نہیں۔ ۱۹۲۰ء میں بسنت کی جگہ گاندھی ہوم رول لیگ کے صدر بنے۔ بسنت نے لیگ سے علیحدگی اختیار کر لی۔ کیونکہ لیگ میں مذہب در آیا تھا۔ انگلستان اور ہندوستان میں لبرل پارٹی کے ممتاز لیڈروں نے سیاست اور مذہب کو الگ الگ رکھنے کے لئے کام کیا تھا۔ لیکن بسنت کی علیحدگی سے اس کے برعکس رجحان کی عکاسی ہوتی تھی۔۔۔۔۔ عوام میں سیاسی شعور بیدار کرنے کے لئے مذہب کو سیاست میں داخل کرنا سمجھ میں آتا ہے، لیکن بہر حال اس کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ خود تقسیم ہند بھی اسی پالیسی کا واضح نتیجہ تھا۔

گاندھی نے مکمل آزادی کو ہوم رول لیگ کی منزل قرار دے دیا۔ البتہ اس آزادی کے حصول کے لئے آئینی ذرائع استعمال کئے جانے تھے۔ ہوم رول لیگ کے قوانین کے تحت اس کے دستور میں تبدیلی لانے کے لئے نوٹس دینا اور چوتھائی اکثریت ضروری تھی۔ لیکن گاندھی نے نوٹس دیئے بغیر سادہ اکثریت کے ذریعے دستور میں تبدیلی کر دی۔ جب جناحؒ نے اس حرکت کے خلاف احتجاج کیا تو گاندھی نے بحیثیت صدر ان کے اعتراض کو رد کر دیا۔ چنانچہ جناح اپنے انیس ساتھیوں سمیت ہوم رول لیگ سے الگ ہو گئے۔ ان ساتھیوں میں منشی بھی شامل تھے۔ منشی نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جب گاندھی نے جناحؒ اور ان کے ساتھیوں کو ہوم رول لیگ چھوڑنے پر مجبور کر دیا تو ہم نے محسوس کیا کہ گاندھی جی (جن کا عوام پر گہرا اثر ہے) نے غیر آئینی طریق

شروع کی ہے۔ جس کا نتیجہ وسیع پیمانے پر فسادات ہو گا اور اس طرح سیاسی خود اختیاری کے اداروں کو نقصان پہنچے گا۔ جن کی بنیاد تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک پر رکھی گئی ہے۔ (یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کے اشتراک سے جو سیلف گورنمنٹ کا عمل جاری ہے وہ رک جائے گا) اس تحریک سے فرقہ وارانہ فسادات جنم لیں گے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ بہر حال جناحؒ نے حقیقت پسندی سے کام لیتے ہوئے گاندھی جی سے اس موضوع پر گفتگو کرنے سے انکار کر دیا۔

دوسرا واقعہ گاندھی جی کا تحریکِ خلافت کی حمایت کرنا تھا۔ تحریکِ خلافت خالصتاً مذہبی تحریک تھی، جیسا کہ خود گاندھی نے ۲۰ اکتوبر ۱۹۲۱ء کے یگ انڈیا میں بیان کیا کہ اگرچہ خلافت میرے اور مولانا محمد علی کے درمیان اتحاد کا باعث ہے اور یہ مولانا محمد علی کے لئے مذہبی معاملہ ہے۔ لیکن اگر میں خلافت کے لئے جان قربان کر کے مسلمانوں کے چاقوؤں سے گائے کو محفوظ کر سکوں تو یہ میرے دھرم کا تقاضا ہے۔

بہر حال گاندھی کا خیال تھا کہ وہ تحریکِ خلافت کی حمایت کر کے مسلم ہندو اتحاد کی بنیادیں مضبوط کر رہا ہے۔ منشی کے بقول جناحؒ نے گاندھی کو وارننگ دی کہ وہ مسلمان رہنماؤں کی تشدد پسندی کو ہوانہ دیں۔ بے شک جناح واحد انسان نہیں تھا جس نے اس خطرے کو محسوس کیا۔ سری نیواس شاستری نے بھی لکھا ہے کہ مجھے خدشہ ہے کہ یہ تحریک ہمیں تباہی کی طرف لے جائے گی۔

بہت سے مصنفین نے گاندھی جی کی خلافت کی حمایت کو غلطی قرار دیا ہے۔ کئی برس بعد گاندھی نے رچرڈ کیسی، گورنر بنگال کو بتایا کہ جناحؒ نے اسے کہا تھا کہ وہ مذہب کو سیاست میں لا کر ہندوستانی سیاست کو تباہ کر رہے ہیں۔ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے مذہبی جذبات کو ابھارنا ہندوستان کے اتحاد کے لئے خطرناک تھا اور یہی روش مستقبل میں تباہی کا باعث بنی۔

ابھی تحریکِ خلافت جاری تھی جب ۱۹۲۱ء میں پرنس آف ویلز (بعد ازاں بادشاہ ایڈورڈ ہشتم) ہندوستان آئے۔ گاندھی نے ان کی آمد کا بائیکاٹ کیا۔ جو خاصی حد تک کامیاب رہا۔ اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں پرنس کا کلکتہ کا دورہ (جہاں اسے وکٹوریہ میموریل کی نقاب کشائی کے لئے آنا تھا) ناکام نہ ہو جائے ”وائسرائے لارڈ ریڈنگ نے پنڈت مدن موہن مالویہ، سی آر داس اور مولانا ابوالکلام آزاد سے رابطہ کیا جو اس وقت جیل میں بند تھے۔ وائسرائے نے پیش کش کی کہ وہ ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے سوال پر غور و فکر کے لئے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس بلائیں گے۔ بشرطیکہ پرنس کا دورہ کلکتہ کا بائیکاٹ ختم کر دیا جائے۔ داس اور آزاد اس شرط پر پیش کش قبول

کرنے کے لئے تیار تھے کہ تمام کانگریسی لیڈروں کو گول میز کانفرنس سے قبل رہا کر دیا جائے۔ جب یہ نقطہ نظر گاندھی کو پہنچایا گیا تو اس نے اصرار کیا کہ کانفرنس کی پیش کش پر غور کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے کانگریسی لیڈروں بشمول محمد علی شوکت علی کو رہا کیا جائے۔ بعد ازاں گاندھی نے بمبئی میں کانفرنس کی۔ جس میں انہی شرائط پر رائونڈ ٹیبل کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی جو اس سے قبل پنڈت مالویہ تجویز کر چکا تھا۔ اسی دوران پرنس آف ویلز جا چکا تھا۔ اور وائسرائے کی ان تجاویز میں دلچسپی ختم ہو چکی تھی۔ مولانا ابوالکلام کے نزدیک یہ گاندھی کی فاش غلطی تھی اور اس طرح ہم آزادی ہند کی جانب پیش رفت سے محروم رہے۔ منشی کا خیال ہے کہ اگر گاندھی وائسرائے کی تجاویز مان لیتا تو ہم ۱۹۳۷ء سے قبل ہی ڈومنین کا درجہ حاصل کر لیتے اور اس طرح ہندوستان تقسیم ہونے سے بچ جاتا۔ یہ موقع بہت سے مواقع میں سے ایک ہے جو گاندھی کی سربراہی میں کانگریس نے ضائع کئے اور جن سے ہندوستان آزاد بھی ہو سکتا تھا اور ہندو مسلمان اکٹھے بھی رہ سکتے تھے۔“

تقسیم ہند، افسانہ اور حقیقت، مصنف ایچ ایم سیروانی
مترجم ڈاکٹر صفدر محمود، صفحہ نمبر ۲۵-۲۷

ایچ ایم سیروانی اپنی مذکورہ بالا کتاب میں تحریر کرتے ہیں کہ ”شیو راؤ نے ۱۹۶۹ء میں اپنی کتاب میں لکھا کہ حتیٰ کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد تک جناحؒ پاکستان بنانے کا ارادہ نہیں رکھتا تھا جناحؒ نے ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد ایک بیان میں کھلے بندوں یہ کہا کہ ”اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں مناسب سمجھوتہ ہو جائے تو مجھ سے زیادہ کون خوش ہو گا۔ اور مجھ سے زیادہ کون اس ضمن میں مددگار ثابت ہو گا۔ جناح نے گاندھی کو بھی اپیل کی کہ وہ اس مسئلے کو حل کرے۔ گاندھی کا جواب تکلیف دہ تھا۔ ”کاش! میں کچھ کر سکتا لیکن میں بالکل بے بس ہوں۔ میں اتحاد میں یقین رکھتا ہوں لیکن مجھے دور تک روشنی نظر نہیں آتی۔ ہر طرف تاریکی ہے اور میں ان مصیبت کے لمحات میں خدا سے روشنی مانگتا ہوں۔“

بہر حال گاندھی کی روشنی کے لئے درخواست کا اللہ تعالیٰ کی جانب سے کوئی جواب نہیں آیا۔

ہندوستان میں تین برسوں کے اندر اندر حالات کس طرح بدلے کہ تحریک (پاکستان) مضبوط بن کر ابھری اس کا جواب یہ ہے کہ انتخابات سے قبل کانگریس کو یوپی میں اکثریت حاصل ہونے کا احساس نہیں تھا۔ چنانچہ کانگریس نے مسلم لیگ سے سمجھوتہ کر لیا جس کا اطلاق یوپی سے باہر بھی ہونا تھا۔ اس سمجھوتے کا مقصد انتخابات کے دوران دونوں جماعتوں کو مل کر کام کرنے پر

پابند کرنا تھا۔ چنانچہ جب کانگریس نے انتخابات کے بعد مسلمانوں کو اپنے ساتھ شریک کرنے سے انکار کر دیا تو مسلمانوں اور ان کے رہنماؤں نے اسے وعدہ خلافی تصور کیا۔ اس کے بعد نہرو نے مسلمانوں کو اپنے پیچھے لگانے کے لئے عوامی مہم شروع کی جو ناکام بھی رہی اور اس سے مزید پیچیدگیاں پیدا ہوئیں۔ مسلمانوں کو احساس ہوا کہ اب مسلم لیگ کا وجود خطرے میں ہے چنانچہ انہوں نے کانگریس کی عوامی مہم کے جواب میں موثر پروپیگنڈہ مہم شروع کر دی۔ یہ پبلیٹی اس قدر موثر تھی کہ بہت سے مسلمان انتخابی حلقوں کے ضمنی انتخابات میں کانگریس ہار گئی۔ ان شکستوں نے ثابت کر دیا کہ نہرو اور کانگریس نے بہت بڑی حماقت کی ہے۔

یہ بھی ایک بد قسمتی تھی کہ مخلوط حکومت سے انکار اور ۱۵ اکتوبر ۱۹۳۷ء جناح کی لکھنؤ میں تقریر کے بعد جناحؒ اور گاندھیؒ اور نہروؒ اور گاندھیؒ میں خط و کتابت شروع ہو گئی۔ گاندھیؒ نے جناحؒ کی لکھنؤ والی تقریر کو اعلان جنگ قرار دیا۔ جب کہ جناحؒ کا موقف تھا کہ یہ محض اپنے دفاع کی کوششیں ہیں۔ اس ضمن میں سب سے زیادہ نقصان وہ نہروؒ کا وہ خط ہے جو انہوں نے جناحؒ کے نام چھ اپریل ۱۹۳۸ء کو کانگریس کی جانب سے لکھا۔ اس میں نہروؒ نے لکھا۔ ”ظاہر ہے کہ مسلم لیگ ایک اہم فرقہ وارانہ جماعت ہے اور ہم اس کے ساتھ ایسا ہی سلوک کرتے ہیں۔ ہمیں ان تمام تنظیموں اور افراد کے ساتھ نبھنا پڑتا ہے۔ جن سے ہمیں پالا پڑتا ہے اور اس سلسلے میں ہمارے پاس ایسا کوئی پیمانہ نہیں جس سے ہم ان کی اہمیت کا اندازہ لگائیں بہر حال جو تنظیم جتنی اہم ہوتی ہے اسے اتنی ہی اہمیت ملتی ہے لیکن یہ اہمیت باہر سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اس کا انحصار تنظیم کی اپنی باطنی قوت پر ہوتا ہے اور دوسری تنظیمیں چاہے وہ چھوٹی یا کم عمر ہوں ان سے صرف نظر نہیں کیا جاسکتا۔“

نہروؒ کے اس خط کا جواب جناحؒ نے ان الفاظ میں دیا۔ ”آپ کے خط کا انداز اور تیور اسی غرور اور تشدد کی عکاسی کرتا ہے۔ اس سے یہ تاثر ابھرتا ہے جیسے اقتدار اعلیٰ کانگریس کے پاس ہے۔ میں یہ بات عوامی سطح پر بھی کہہ چکا ہوں کہ میرے خیال میں اگر کانگریس مسلم لیگ کے ساتھ برابری کا سلوک نہیں کرتی تو پھر ہمیں اس وقت کا انتظار کرنا پڑے گا جب تک ہماری قوت اتنی نہیں ہوتی کہ ہمیں مناسب اہمیت دی جائے۔“ کانگریس کے اس رویے اور جماعتی قوت کے طعنے نے سنجیدہ صورت حال کو جنم دیا جس کے ۱۹۴۶ء میں خطرناک نتائج نکلے۔

تقسیم ہند، افسانہ اور حقیقت، مصنفہ ایچ ایم سیروانی

ترجمہ اور اضافے، ڈاکٹر صفدر محمود، صفحہ نمبر ۳۳ - ۳۴

ایچ ایچ سیروانی حضرت قائد اعظمؒ کے ضمن میں مزید اپنی کتاب میں تحریر کرتے ہیں۔

”جب گاندھی نے کانگریس کی قیادت سنبھالنے کے بعد آزادی کے حصول کے لئے آئینی ذرائع کو خیرباد کہا تو جناحؒ نے بھی کانگریس کو چھوڑ کر ہوم رول لیگ میں شرکت اختیار کر لی۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ غیر آئینی طریقے تشدد اور فسادات کو جنم دیں گے مزاج اور تربیت کے حوالے سے وہ جذباتی خطابت سے گریز کرتے تھے۔ لیکن وہ مضبوط اور موثر مقرر تھے، چاہے عدالت ہو یا جلسہ عام۔ بقول چھاگلہ ”جناح کی سب سے بڑی خوبی مستقل مزاجی تھی۔ اگر وہ ایک بار ارادہ کر لیتے تو پھر دنیا کی کوئی قوت بھی انہیں مقصد کی راہ سے ہٹا نہیں سکتی تھی۔ کوئی ترغیب، رشوت یا دباؤ ان پر اثر انداز نہیں ہوتا تھا۔ اور ان کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ انہوں نے ایک نیا ملک بنا دیا..... پاکستان..... حالانکہ انہیں طاقتور پریس کی حمایت حاصل نہ تھی۔ ان کے مالی وسائل قلیل تھے اور عوامی حمایت بھی واجب سی تھی۔“

”جناح آئینی ذرائع میں یقین رکھتے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ راست اقدام کا نتیجہ وسیع تشدد اور ہندو مسلم فسادات کی صورت میں نکلے گا۔ جولائی ۱۹۴۶ء میں جناحؒ کے پاس راست اقدام کا ہتھیار نہیں تھا۔ جسے کانگریس انگریزوں کے خلاف موثر انداز سے استعمال کرتی رہی تھی اور دوبارہ استعمال کرنے کی دھمکی دے رہی تھی۔

جناحؒ ایک بہت بڑی اقلیت کا لیڈر تھا۔ لیکن اگر ایک انسان ایک ووٹ کا اصول مان لیا جاتا تو بقول جناحؒ ”برادر گاندھی کے تین ووٹ اور برادر جناحؒ کا ایک ووٹ تھا۔“ — تقسیم ہند کے قریب آنے تک جناحؒ ”مسلم لیگ پر غالب نہیں تھے جس طرح گاندھی کانگریس پر..... جناحؒ کو پنجاب میں سرسکندر حیات، بنگال میں فضل الحق اور دیگر مقامی لیڈروں سے نبھا کر نا تھا۔“

تقسیم ہند، افسانہ اور حقیقت، مصنفہ ایچ ایم سیروانی

(ترجمہ اور اضافے، ڈاکٹر صفدر محمود، صفحہ نمبر ۵۸ - ۵۹)

ایچ سیروانی تقسیم ہند کے ضمن میں گاندھی کو ذمہ دار ٹھہراتے ہیں۔ ان کی سیاسی غلطیوں کو اجاگر کرتے ہیں مگر جہاں تک حضرت قائد اعظمؒ کے سیاسی کردار اور قومی خدمات کا تعلق ہے۔ انہوں نے برملا اظہار کر کے حضرت قائد اعظمؒ کو ایک عظیم ترین قائد ثابت کر دیا ہے۔ وہ مزید یہ کرتے ہیں۔ کہ

کابینہ مشن پلان کی ناکامی کی وجوہ

”اس ناکامی کی ذمہ داری بہت سے عوامل پر ہے۔ جن میں گاندھی، نہرو، ٹیل، جناح

تھک لارنس اور کرپس کی شخصیات بھی شامل تھیں۔ لیکن سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ ہندو مسلم اتحاد پر بار بار زور دیا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس نے عملی طور پر اتحاد کے لئے کوئی کوشش نہ کی۔ وہ اکثر اوقات مسائل کا حل باطنی روشنی (آسمانی راہنمائی) پر چھوڑ دیتا۔ لیکن وہ ہمیشہ باطنی روشنی سے محروم رہا۔ قارئین ضرور سوچیں کہ ہندو مسلم اتحاد کوئی مذہبی مسئلہ نہیں تھا جس کے لئے باطن کی روشنی یا خدائی راہنمائی کی ضرورت تھی۔ یہ ایک سیاسی مسئلہ تھا۔ اس کا حل بھی سیاسی ہی ہونا چاہئے تھا۔ گاندھی نے یہ حل ڈھونڈنے کی ہرگز کوشش نہ کی۔

دوسری افسوس ناک بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گاندھی کو روشنی (راہنمائی) دینے سے کار کر دیا، یعنی محروم رکھا اور گاندھی نے آزادی کی پیش کردہ روشنی کو مسترد کر دیا۔ جب کہ آزاد کا نگریسی، ممتاز نیشنلسٹ اور نہرو گاندھی کا قریبی دوست تھا۔ یہی نہیں کہ گاندھی نے آزادی کی لائی ہوئی روشنی سے آنکھیں پھیر لیں بلکہ انہوں نے دوسرے نیشنلسٹ مسلمانوں کی روشن کردہ راہ کو بھی درخور استثناء سمجھا۔ لیکن یہ کوئی حیرت کی بات نہیں، کیونکہ ۱۹۳۶ء - ۱۹۳۵ء کے انتخابات سے ذرا قبل نیشنلسٹ مسلمانوں کی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ ان کو ضرورت کے مطابق استعمال کیا جاتا تھا اور اب وہ کانگریس کے لئے اس سے زیادہ قابل توجہ نہیں رہے تھے کہ کبھی کبھار انہیں ان کے قومی رویے اور نیشنلسٹ نقطہ نظر پر شاباش دے دی جائے۔

اگرچہ گاندھی محسوس کرتا تھا اور اس نے درست طور پر تسلیم کیا کہ ۱۹۳۵ء کے انتخابات کے بعد مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت کی نمائندگی کا حق صرف مسلم لیگ کو حاصل ہے۔ اس کے وجود گاندھی نے ۶ مئی ۱۹۳۶ء کو ویول اور کابینہ مشن کو بتایا ”ہمیں (مشن کو) یا تو کانگریس کے نقطہ نظر کو پوری طرح قبول کرنا ہے اگر یہ ہمارے نزدیک مبنی بر انصاف ہے اور پھر جملہ کے نقطہ نظر کو تسلیم کرنا ہے اگر ہم سمجھیں کہ وہ زیادہ منصفانہ ہے کیونکہ اس میں بین بین یا درمیانی سورت ممکن نہیں۔“ ویول نے مزید لکھا ہے۔ ”گاندھی کو خانہ جنگی کے امکانات بھی متاثر نہ کر گئے۔ میرا خیال ہے کہ وہ ٹیل کے اس غلبے (نقطہ نظر) پر عمل کر رہا ہے کہ ہم ڈٹے رہیں تو مسلمان نہیں لڑیں گے۔“

پھر گاندھی نے پلان کی روح اور مقصد کو سمجھ بغیر اس کے خلاف مرن برت رکھ لیا۔ اس دلیل یہ تھی کہ چونکہ پلان میں محض سفارش کی گئی ہے اس لئے دونوں پارٹیاں اس پر عمل کرنے پر آمادہ نہیں ہیں۔ دوسرا اعتراض یہ تھا کہ چونکہ پلان دونوں پارٹیوں میں سمجھوتہ نہیں کروا سکا اس لئے یہ سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔

کرے اس کی شقوں کو بدل لے یا پلان کی کسی بھی شق کو مسترد کر دے۔ اب تک کے مطبوعہ ریکارڈ اور دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ گاندھی شعوری اور لاشعوری طور پر ہندو اکثریت کے حسن ظن میں مبتلا تھا اور سمجھتا تھا کہ ہندوستان کی اکثریت کے بل بوتے اور راست اقدام کی دھمکی سے وہ متحدہ ہندوستان آزاد کرالے گا۔ مسلم لیگ مانے نہ مانے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ایک غیر ملکی صحافی کو انٹرویو دیتے ہوئے گاندھی نے کہا ”ہندوستان آزادی کی راہ پر چل رہا ہے اور آزادی بہت قریب ہے چاہے کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ ہو یا نہ ہو۔ اسے کوئی روک نہیں سکتا۔ ہندوستان آزادی کے لئے کافی خون بہا چکا ہے۔“

جب اس صحافی نے یہ پوچھا کہ یہ بہتر نہیں ہو گا کہ تھوڑی سی قربانی کر کے تصفیہ کر لیا جائے تو گاندھی کا جواب تھا ”ہم ایک مشکوک فائدے کی خاطر اصول قربان نہیں کر سکتے“۔ اس انٹرویو میں گاندھی نے کہا کہ دونوں میں سے ایک پارٹی بہر حال غلطی پر ہے۔“
(تقسیم ہند، افسانہ اور حقیقت، مصنفہ ایچ ایم سیروائی
ترجمہ اور اضافے ڈاکٹر صفدر محمود صفحہ ۷۲ - ۷۳)

یہاں برسیل تذکرہ لارڈ مونٹ بیٹن کے ضمن میں ان کے اپنے ہی ہم وطنوں کی آراء اور نظریات قارئین کی دلچسپی کا باعث بنیں گے کہ جب وہ برصغیر میں وائسرائے کی حیثیت سے آئے اور انہوں نے برصغیر کی سیاست میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیئے ایک طویل داستان ہے۔ یہ داستانیں سینکڑوں کتب میں چھپ بھی چکی ہیں۔ یہاں صرف اجمالی تذکرہ پیش کیا جائے گا۔ ایچ ایم سیروائی اپنی کتاب میں اس کا تذکرہ یوں کرتے ہیں۔

”کہانی مشہور ہے کہ جب نہرو مونٹ بیٹن سے ملا تو اس کے پر اعتماد لہجے اور اتھارٹی سے بہت متاثر ہوا۔ مونٹ بیٹن کے ہندوستان پہنچنے کے چند دن بعد نہرو نے اس سے پوچھا ”کیا کسی معجزے کے تحت آپ کو مکمل اختیارات مل گئے ہیں۔“ مونٹ بیٹن نے کہا ”فرض کریں کہ اگر ایسا ہی ہو تو اس سے کیا فرق پڑے گا“ نہرو نے جواب دیا ”آپ کیسے کامیاب ہوں گے جب کہ باقی تمام ناکام ہو چکے ہیں“۔ کلی اختیارات کے بارے میں مونٹ بیٹن نے نہرو سے جو بھی کہا ہو حقیقت یہ ہے کہ اس پر کوئی خصوصی اختیارات نچھاور نہیں کئے گئے تھے۔ جیسا کہ ڈیگر نے لکھا ہے کہ ”کلی اختیارات کا مطلب ہوتا ہے کہ اپنی مرضی سے حکومت برطانیہ سے رجوع کئے بغیر فیصلے کرنے کا اختیار..... کیا مونٹ بیٹن کو اس طرح کی آزادی کبھی حاصل تھی۔ اس کے برعکس اس نے نہ صرف اپنا سٹیبلشمنٹ کا ڈرافٹ پلان لندن منظوری کے لئے بھیجا دیا بلکہ جب اسے اس میں تبدیلیاں کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی تو وہ لندن گیا تاکہ اپنے نقطہ نظر کو خود پیش کر

سکے۔

Mountbatten By Zeigler P355-356

بلاشبہ مونٹ بیٹن کو موقع کے مطابق فیصلہ کرنے کی اجازت تھی۔ جو ویول کو حاصل نہیں تھی۔ ماسوائیک نقطے کے جسے کانگریس نہایت اہم سمجھتی تھی۔ مونٹ بیٹن نے جو بھی چاہا، ایٹلی کی حکومت نے عام طور پر سر تسلیم خم کر لیا۔

اب جبکہ ہندوستان میں انتقال اقتدار سے متعلق سارا سرکاری ریکارڈ ٹرانسفر آف پاور کے عنوان سے چھپ چکا ہے اور یہ ۱۹۴۷ء تک ساری پیش رفت کا احاطہ کرتا ہے۔ اس لئے اب مونٹ بیٹن کے عہد اقتدار کا صحیح تجزیہ کیا جاسکتا ہے، خاص طور پر یہ بات اہم ہے کہ اب تک مونٹ بیٹن سکول آف تھٹ (مکتبہ فکر) کی جانب سے ”مشن دو مونٹ بیٹن“، ”گریٹ ڈیوائیڈ“ اور ”فریڈم اینڈ مڈنائٹ“ جیسی کتب شائع ہو چکی ہیں اور خود مونٹ بیٹن پر زیگلر کی کتاب چھپ چکی ہے اس لئے تحریک آزادی کے اس اہم حصے پر اس قدر مواد سامنے آچکا ہے کہ اب اس دور کا منصفانہ جائزہ لیا جاسکتا ہے۔ زیگلر کی کتاب ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی۔ اگرچہ یہ کتاب مونٹ بیٹن کی مدح لگتی ہے تاہم اس میں تنقید بھی ہے زیگلر نے اس کتاب میں مونٹ بیٹن کے بارے میں جو ذاتی تاثرات دیئے ہیں ان کا تھوڑا سا ذکر کر لیا جائے۔

زیگلر لکھتا ہے کہ ۱۹۷۳ء میں سولی ذکر مین نے بڑی محنت سے مونٹ بیٹن کا سکیچ لکھا اور مونٹ بیٹن کو دکھایا جو بظاہر خوش ہوا اور کہنے لگا ”بلاشبہ مجھے کوئی اچھی طرح نہیں جانتا اور نہ ہی موثر انداز سے میری خامیوں کو بے نقاب کر سکتا ہے، کیونکہ ایسی تصویر کا کیا فائدہ جس میں داغ نہ ہوں۔“ چنانچہ زیگلر لکھتا ہے کہ بے شک داغوں کے بغیر مونٹ بیٹن کی تصویر کسی کو پسند نہیں آئے گی اور نہ ہی کوئی اس کا قائل ہو گا۔ ان الفاظ کے بعد اس نے مونٹ بیٹن کی شاندار تصویر کھینچی ہے۔ ”اس کی باقی تمام باتوں کی مانند، اس کے نقائص بھی بہت عظیم اور نمایاں ترین تھے اس کا غرور اگرچہ بچوں جیسا تھا، لیکن نہایت قابل نفرت اور اس کی اقتدار کی ہوس اور خواہش بالکل بے لگام تھی۔ اس کے ہاتھ میں سچائی جو ”در اصل ہے۔“ سے جو ”چاہے کی شکل اختیار کر لیتی تھی یعنی وہ حقیقت کو اپنی مرضی کے سانچے میں ڈھال لیتا تھا۔ اس نے تاریخ کو اس طرح لکھنے کی کوشش کی کہ حقائق سے منہ پھیر کر صرف اس کی کامیابیوں کا مبالغہ آمیز ذکر ہوا ایک وقت وہ بھی آیا کہ مجھے بہت غصہ آیا، کیونکہ مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے دھوکہ دینے پر تلا ہوا ہے۔ چنانچہ میں نے مجبور ہو کر یہ نوٹس لکھا اور اپنے میز پر چپکا دیا۔“ یاد رکھو! ہر بات کے باوجود ایک عظیم انسان تھا۔

ان الفاظ سے عیاں ہے کہ مونٹ بیٹن اپنی کامیابیوں کا ڈھنڈورا پیٹنے کے لئے جھوٹ کو بیچ پر ترجیح دیتا تھا اور یہ ایک قابل ذکر حقیقت ہے ریگلر نے مونٹ بیٹن کی ہندوستان کے وائسرائے کی حیثیت سے جو لفظی تصویر کھینچی ہے وہ زیادہ دلچسپ ہے۔ ”ان دنوں جہاں تک ممکن تھا کھلی سیاست اور ڈپلومیسی کا رواج تھا لیکن اس کھلے پن کا مطلب یہ نہیں کہ جوڑ توڑ یا دھوکہ دہی نہیں تھی۔ لیکن یہ سب کچھ اس کے دونوں پیشروں کے لئے ناقابل تصور تھا۔ مونٹ بیٹن آگاہ تھا کہ اس کے بعض مشیر محسوس کرتے ہیں کہ اس کے ہتھکنڈے بعض اوقات غیر اخلاقی قسم کے ہوتے ہیں۔ لیکن اس کا خیال تھا کہ عظیم تر بھلائی کے حصول کے لئے شعبہ بازی جائز ہے۔ سیدھا سادا جھوٹ نہ بولا جائے۔ لیکن حالات کے سبب جھوٹ قابل قبول ہے۔ اس کے ڈپٹی پرائیویٹ سیکرٹری آیان سکاٹ کو یاد ہے کہ مونٹ بیٹن کوئی اقدام تجویز کرنے کے بعد اوپر دیکھا کرتا اور میرے اور ایمل کے چہرے کے تاثرات پڑھا کرتا، پھر وہ کہتا ”میں جانتا ہوں تم کیا سوچ رہے ہو۔ (تم سوچ رہے ہو کہ) ویول کبھی ایسا نہ کرتا بہر حال میں ویول نہیں ہوں“

سوانح نگار کی حیثیت سے ریگلر نے مونٹ بیٹن کی صاف، واضح اور خوشگوار تصویر پیش کی ہے۔ اور اس کے کارناموں کا بھی ذکر کیا ہے، البتہ ایک جرات مندانہ سوانح نگار زیر تحریر شخصیت کا تاریخ میں مقام گرا سکتا ہے جب ایک بار یہ بات تسلیم کر لی جائے کیونکہ مطبوعہ مواد سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ مونٹ بیٹن بحیثیت وائسرائے اپنی شان و شوکت اور عزت بڑھانے کے لئے جھوٹ کو بیچ پر ترجیح دیتا تھا۔ وہ جوڑ توڑ، دھوکہ دہی، شعبہ بازی اور موقع کے مطابق جھوٹ بولنے سے گریز نہیں کرتا تھا تو پھر انتقال اقدار میں اس کا رول بہت زیادہ مشکوک ہو جاتا ہے۔ اس پر اعتماد مجروح ہوتا ہے اگر پوری طرح ختم نہ ہو تو اس کے بیانات اور گواہیاں اور یہ کہ دوسروں نے اسے کیا کہا قابل قبول نہیں رہتا۔ جب تک کہ ان کی چھان بین نہ کی جائے اور دوسرے ٹھوس شواہد دستیاب نہ ہوں۔ مونٹ بیٹن کے عہد کا مطالعہ کرتے ہوئے قارئین کو یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے خاص طور پر یہ بات ذہن میں رہنی چاہئے کہ مونٹ بیٹن قابل نفرت حد تک مغرور انسان تھا جب کہ وہ خود اور اس کے سٹاف کے اراکین جنح ”کو غرور کا الزام دیتے ہیں۔“

(تقسیم ہند، افسانہ اور حقیقت: مصنفہ ایچ ایم سیروائی)

ترجمہ اور اضافے: ڈاکٹر صفدر محمود صفحہ نمبر ۱۱۹-۱۲۲)

یہاں لارڈ مونٹ بیٹن کا ذکر کرنا اس لئے ضروری تصور کیا ہے کہ مذکورہ بالا کتاب کا مصنف کوئی مسلمان مصنف نہیں بلکہ ایک پارسی مصنف ہے جس نے تقسیم ہند کے مرحلے کو اپنی حقیقت پسندانہ نظر سے دیکھا ہے، اور پھر اس تقسیم ہند کے ڈرامے میں ملوث ان تمام کرداروں کا

بے لاگ تبصرہ اور تجزیہ کیا ہے۔ جو تاریخ کے آئینے میں صاف اور واضح طور پر نظر آرہے ہیں۔ حضرت قائد اعظمؒ کا ایچ ایم سیروائی کی نظر میں جو تھا انہوں نے واضح کر دیا۔ قیادت و سیاست کے اعلیٰ معیار کو اگر بیگانے سراہیں تو مزا اس بات میں ہے۔ یہ اس سعادت بزرگ نیست

ایچ ایم سیروائی مہاتما گاندھی کے ضمن میں تحریر کرتے ہیں۔

”انتقال اقتدار کے حوالے سے ایک نوٹ یاد آیا جو میجر واث نے ۱۳ اپریل ۱۹۴۶ء کو تیار کیا تھا اور اس کی گاندھی سے گفتگو پر مشتمل تھا۔ اس میں کہا گیا تھا ”وہ (گاندھی) سمجھتا ہے کہ ہندوستان کے مسائل کے حل کے لئے خون بہانا پڑے گا۔ وہ کانگریس پر عدم تشدد کے لئے زور دے گا۔ لیکن اسے توقع نہیں کہ وہ اس پر عمل کریں۔ خانہ جنگی کی صورت میں وہ توقع کرتے ہیں کہ کانگریس اچھی طرح لڑے گی اور ایک دانت کے بدلے ایک دانت نکالے گی اور برطانیہ کی مانند ایک دانت کے بدلے سو دانت نہیں لے گی۔“

(بحوالہ ٹرانسفر آف پاور، جلد ہفتم، صفحہ نمبر ۲۶۲)

گاندھی نے ۲۷ اگست ۱۹۴۶ء کو مقدمات کے دوران ویول سے کہا کہ ”اگر ہندوستان کو قتل عام کی ضرورت ہے تو پھر خون بنے گا“ قدرتی طور پر ویول گاندھی سے یہ الفاظ سن کر سکتے ہیں آگیا۔ بقول ویول اسے بے حد صدمہ ہوا۔

اسی طرح مونٹ بیٹن نے بھی لکھا ہے کہ یکم اپریل ۱۹۴۷ء کو ایک انٹرویو کے دوران ”گاندھی نے مجھے کہا کہ جو کچھ بھی ہو، سچائی کا ساتھ دو، چاہے صحیح حل کے لئے ہندوستان سے جاتے وقت انسانی زندگیوں کی بے پناہ قربانی دینی پڑے۔“

گاندھی کے ان بیانات کو آسانی سے اس کے اس دعویٰ کے ساتھ ہم آہنگ نہیں کیا جا سکتا کہ عدم تشدد میرے مسلک کا بنیادی حصہ ہے اس طرح کا مسلک گاندھی کے ان بیانات کے ساتھ موافقت نہیں رکھتا۔ جن میں کہا گیا ہے اس طرح کے خون کا غسل ناگزیر ہے۔ وائسرائے کو مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ سچائی پر عمل کرے۔ چاہے بے پناہ انسانی خون بنے (یہ بھی ایک طرح کی منافقت تھی) کہ گاندھی اپنے مریدوں، پیروکاروں کو عدم تشدد کی تلقین یہ جانتے ہوئے کیا کرتے تھے کہ میری تلقین مسترد کر دی جائے۔ کیا اس صورت میں یہ توقع جائز تھی کہ ایک دانت کے بدلے ایک ہی دانت (کیونکہ لڑائی میں حساب رکھنا ناممکن ہوتا ہے) اس سلسلے میں نہرو نے کرپس کو ایک سوال کے جواب میں کہا ”مجھے سمجھ نہیں آتی کہ مسلم لیگ دستور ساز اسمبلی میں کیوں نہیں آتی اور توضیح کے لئے فیڈرل کورٹ میں کیوں نہیں جاتی۔ اس کے علاوہ پھر دوسرا معیار تو لڑائی کا

معیار ہے۔“

(ٹرانسفر آف پاور، جلد نہم، صفحہ نمبر ۲۵۹)
اگر ان اشاروں (خونین غسل، تباہی، لڑائی کا معیار) کا مقصد مسلم لیگ کو یہ بتانا تھا کہ اگرچہ گاندھی عدم تشدد کا پرچارک ہے۔ لیکن اگر مسلم لیگ کانگریس کی کابینہ مشن پلان کی توثیق نہیں مانتی تو پھر وہ نہرو اور گاندھی خونین غسل، قتل عام اور لڑائی کے لئے تیار ہیں تو ان اشاروں کا خاص طور پر یہ جس فضا میں کئے گئے۔ الٹا اثر ہوا۔ اگر یہ دھمکیاں مسلم لیگ کو جھکا سکتیں تو پھر کانگریس کے دباؤ کے تحت حکومت برطانیہ بھی عبوری حکومت کو ڈومنین کا درجہ دے دیتی۔ اس سے کانگریس کو ہندوستان کی پوری مشینری پر کنٹرول حاصل ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو اس قدر مضبوط بنا لیتی کہ جب جون ۱۹۴۸ء میں برطانیہ اقتدار سے الگ ہوتا تو کانگریس خود ہی مسلم لیگ سے نمٹ لیتی۔ مسلم لیگ نے اس دھمکی کا جواب یوں دیا کہ اول تو کانگریس کے ڈومنین درجہ کے مطالبے کی مخالفت کی اور آئیں مسلم لیگ کامیاب رہی۔ دوم مسلم لیگ نے زور دیا کہ اگر حکومت برطانیہ کانگریس کے دباؤ کا مقابلہ کر کے اپنی ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکتی تو پھر وہ جلد از جلد تشریف لے جائے۔ چنانچہ لیاقت علی خان نے کہا ”وائسرائے مسلمانوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتا جب کہ حکومت برطانیہ احسن طریقے سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لئے تیار نہ ہو۔ ضرورت پڑے تو یہاں گھبرنے کے لئے بھی۔ ان کے لئے بہتر ہو گا کہ وہ ملک چھوڑ دیں اور پارٹیوں کو آپس میں معاملات طے کرنے دیں۔“

(تقسیم ہند، افسانہ اور حقیقت، مصنفہ ایچ ایم سیروائی)

ترجمہ اور اضافے، ڈاکٹر صفدر محمود صفحہ ۱۸۱، ۱۸۲)

تقسیم ہند کی ذمہ داری مسٹر گاندھی پر ڈالتے ہوئے ایچ ایم سیروائی لکھتے ہیں۔

”میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ ہندوستان کی تقسیم اور اس کے بعد ہونے والی تباہیوں کی ذمہ داری گاندھی اور نہرو پر عائد ہوتی ہے۔ جنہوں نے کینٹ مشن پلان کو مسترد کر دیا تھا۔ تاہم جیسا کہ انصاف کا تقاضا تھا۔ میں نے ان کی اس کوشش کا ذکر بھی کر دیا ہے جو انہوں نے تقسیم کو روکنے کے لئے کی۔ مگر یہ کوشش بہت تاخیر سے کی گئی۔“

گاندھی نے ہندوستان کو تقسیم سے بچانے کے لئے ایک اور کوشش بھی کی۔ وہ یہ کہ انہوں نے تجویز پیش کی کہ مونٹ بیٹن جناح کو وزیر اعظم بننے کے لئے کہیں، ایک ایسا وزیر اعظم جسے اپنی ٹیم کے انتخاب اور پاکستان کے لئے کام کرنے کی مکمل آزادی حاصل ہو۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کے بارے میں مونٹ بیٹن کی معلومات غیر معمولی طور پر محدود تھیں اور گمان غالب یہ ہے

انہوں نے ۳۰ اپریل ۱۹۳۶ء کو گاندھی اور کینٹ وفد کے درمیان ہونے والی ملاقات کی تفصیلات کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اگر ان کی نظر ان تفصیلات پر ہوتی تو مونٹ بیٹن کو بخوبی علم ہو جاتا کہ گاندھی جناح کو وزیر اعظم بنانے کی تجویز وفد کے روبرو پہلے ہی پیش کر چکے ہیں اور اسے ناقابل عمل قرار دیا جا چکا ہے۔ گاندھی نے اس ملاقات میں کہا تھا۔ کہ

عبوری حکومت کو مکمل طور پر قومی ہونا چاہئے۔ مسٹر جناح اب اس حکومت کے لئے جسے چاہیں منتخب کریں تاہم یہ انتخاب متعلقہ اسمبلی کی رائے کا پابند ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ اگر معاملے دیا اندازہ انداز میں چلایا جائے تو انہیں کونسل کے لارڈ ویول کے سامنے جوابدہ ہونے پر کوئی اعتراض نہیں۔ سیکرٹری آف سٹیٹ نے کہا کہ امر واقع یہ ہے کہ موجودہ حالات میں مسٹر جناح کو اسمبلیوں میں اکثریت حاصل نہیں ہے۔ اگر انہوں نے وزراء کا انتخاب کرنا ہے تو انہیں ان وزیروں کی اکثریت اپنی جماعت کو چھوڑ کر دوسری جماعتوں سے منتخب کرنا پڑے گی مسٹر گاندھی کا کہنا یہ تھا کہ اس حقیقت سے مفر ممکن نہیں کانگریس کو زیادہ تر اسمبلیوں میں اکثریت حاصل ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ صوبائی اسمبلیوں میں سے منتخب اراکین کو مرکزی اسمبلی میں بھیجا جائے۔ جہاں اراکین کو استعفیٰ دلوا کر نشستیں حاصل کی جاسکتی ہیں۔ اس طرح یہ نمائندے مرکزی اسمبلی کے سامنے جوابدہ ہوں گے۔ سیکرٹری آف سٹیٹ نے کہا کہ اس صورت میں بھی امر واقعہ یہ ہے کہ اسمبلی پر ہندو اکثریت کا غیر معمولی غلبہ ہو گا۔ اگر مسٹر جناح اس بنیاد پر اسمبلی تشکیل دینے کے لئے تیار نہیں تو یہ دعوت کانگریس کو دی جاسکتی تھی۔“

مسٹر گاندھی نے کہا کہ وفد کو درپیش صورت حال کی مشکلات پوری طرح ان کی نظر میں ہیں۔ اگر وہ ایک غیر ذمہ دارانہ حد تک رجائیت پسند نہ ہوتے تو اب تک کسی بھی حل کی آس کھو چکے ہوتے۔“

(ٹرانسفر آف پاور۔ جلد ہفتم، صفحہ نمبر ۱۱۶ - ۱۱۸)

جب مونٹ بیٹن نے گاندھی کی تجویز منرو کے سامنے رکھی تو انہوں نے بجا طور پر یہ کہا کہ گاندھی یہ تجویز اس سے پہلے کینٹ مشن کے سامنے پیش کر چکے ہیں اور اس وقت اسے ناقابل عمل قرار دے کر رد کر دیا گیا تھا۔“

(تقسیم ہند، افسانہ اور حقیقت: مصنف ایچ ایم سیروانی)

ترجمہ اور اضافے: ڈاکٹر صفدر محمود، صفحہ نمبر ۲۳۰ - ۲۳۱)

مندرجہ بالا حوالہ جات جتنے بھی تحریر کئے گئے ہیں۔ ان سے دراصل ثابت کرنا یہ مقصود ہے کہ مسٹر گاندھی، منرو، ٹیل وغیرہ کا کردار ایچ ایم سیروانی نے کس انداز سے بیان کیا۔ انہوں

نے ان شخصیات پر کڑی نکتہ چینی کی ہے۔ اور بے لاگ تبصرہ کر کے حضرت قائد اعظمؒ کے سیاسی کردار اور ان کے مثبت طرز عمل کی تعریف کی ہے یہ بات واضح رہے کہ مذکورہ بالا کتاب کا مصنف کوئی مسلمان مصنف نہیں، اپنوں کی تعریف تو اپنے ہی کرتے ہیں۔

سراج نظامی (مرحوم) نے حضرت قائد اعظمؒ کے ضمن میں تحریر کیا ہے۔ اور ان کا یہ حوالہ ہندو استعماریت اور گاندھی ازم کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ ”دسمبر ۱۹۳۸ء میں لیگ کا اجلاس پٹنہ میں ہوا۔ آپ نے اپنے خطبہ صدارت میں سیاسی حالات کانگریس کی حکمت عملی اور ہندو نوازی کا تجزیہ کرتے ہوئے فرمایا۔

میں صرف ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں۔ ریاستوں میں گڑبڑ کیوں کی جا رہی ہے؟ حیدر آباد میں آریہ سماج اور ہندو سبھا کی ساری طاقت کیوں صرف کی جا رہی ہے۔ میں کانگریس سے پوچھتا ہوں کہ وہ کشمیر میں کیا کر رہی ہے؟ آریہ سماجی، مہاسبھائی، کانگریسی قوم پرست، اخبارات، کانگریسی اخبارات، کشمیر کے معاملات پر کیوں خاموش ہیں؟ اس لئے کہ وہ ایک ہندو ریاست ہے اس لئے کہ ریاست کشمیر کی رعایا میں مسلمانوں کی اکثریت ہے میں ہر شخص سے اپیل کرتا ہوں کہ مسلم لیگ میں شامل ہو جائیے یہ آپ کی جماعت ہے، یہ کسی کی ملکیت نہیں ہے یہ آپ کی اپنی تنظیم ہے اور جس راہ پر چلانا چاہیں چلا سکتے ہیں۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں کافی بیداری پیدا ہو چکی ہے۔ یہ آغاز بلاشبہ عظیم الشان ہے۔ اب اگر آپ اپنی ہمت سے کام لے کر اپنے آپ کو ایک منظم فوج کی طرح آراستہ کر لیں تو یقین کیجئے کہ فتح آپ کے قدم چومے گی۔“

مسلمانوں نے قائد اعظمؒ کی اس آواز پر صدق دل سے لبیک کہی اور متحد ہو گئے۔ وہ واقعی ایک جری فوج کی طرح منظم ہو گئے اور جلد ہی اس کا ثبوت بھی فراہم کر دیا۔ ۲۰ فروری ۱۹۴۰ء کو دہلی میں مسلم لیگ کی کونسل کا اجلاس منعقد ہوا تو آپ نے فرمایا۔ ”لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہمارا مطمع نظر کیا ہے؟ بات بالکل صاف ہے، برطانیہ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتا ہے۔ مسٹر گاندھی اور کانگریس، مسلمانوں اور ہندوستان دونوں پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہم نہ برطانیہ کو مسلمانوں پر حکومت کرنے دیں گے، نہ مسٹر گاندھی اور کانگریس کو کرنے دیں گے۔ ہم ان دونوں کے اثر سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔“

یہ واضح اشارہ تھا کہ مسلمانوں کا مطمع نظر اور منزل ایک الگ خطہ، زمین ہے۔ جس میں وہ آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ اس کے باوجود ابھی تک انگریز کے استعماریت پسندانہ اقدامات اور ہندو بنیا مسلمانوں کے مطالبے کے متعلق گولمو کی حالت میں تھا۔ لیکن ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو لاہور میں

مسلم لیگ کے اجلاس میں بات کھل کر سامنے آگئی اور جب اس میں ایک قرارداد منفقہ طور پر منظور ہوئی تو حکومت اور ہندو کو یقین ہو گیا کہ مسلمانوں کا نصب العین پاکستان ہے۔ اس اجلاس کے بعد آپ نے مطلوب سید سے جو اس اجلاس میں موجود تھے، فرمایا ”اس وقت اقبال“ ہم میں موجود نہیں ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوتے تو یہ معلوم کر کے یقیناً مسرور ہوتے کہ ہم نے وہ کچھ کر دکھایا ہے جس کی انہوں نے ہم سے توقع کی تھی“۔

ہندو اخبارات نے جلی سرخیوں کے ساتھ اس قرارداد کا متن شائع کیا اور اسے ”قرارداد پاکستان“ کے نام سے موسوم کیا۔ ۱۹۴۰ء میں قائد اعظمؒ نے فرمایا ”اب دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کی تشکیل کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی“

۲۵ دسمبر ۱۹۴۰ء کو قائد اعظمؒ کی ۶۴ ویں سالگرہ تھی۔ اس موقع پر مختلف ہندو مسلم اور انگریز زعماء نے آپ کو مبارک باد کے پیغامات ارسال کئے۔ انہی میں اچھوتوں کے لیڈر راؤ بہادر ایم سی راجہ بھی تھے۔ آپ نے اپنے پیغام میں لکھا۔ ”تمام مذاہب اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ وقتاً فوقتاً اور نازک ترین موقعوں پر موزوں انسانوں کو دنیا میں بھیجتا رہتا ہے جن کے ہاتھوں اس کی مشیت پوری ہوتی ہے۔ میری رائے میں مسٹر جناح ایک ایسی ہستی ہیں جنہیں اس غرض کے لئے پیدا کیا گیا ہے کہ ان گمراہیوں کی اصلاح کریں جن میں کانگریس کی رہنمائی میں ہندوستانیوں کو مبتلا کر دیا ہے۔“

”ایسے حالات میں ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی۔ جو کانگریس کے مقابلے میں کھڑا ہو کر اسے بتا سکے کہ ان کی جماعت اکثریت اور مالیت کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی طاقتور کیوں نہ ہو سارے ہندوستان کی نمائندہ نہیں ہے۔ میں مسٹر جناح کی تعریف کرتا ہوں انہوں نے ان تمام جماعتوں کے دعاوی کی حمایت کی ہے جنہیں اس ہندو اکثریت کی طرف سے اپنی تباہی کا خطرہ درپیش ہے جو فائدہ ہی کے احکام پر عمل کر رہی ہے۔“

کانگریس کو اپنی اکثریت اور طاقت کا اتنا گھمنڈ تھا کہ وہ مسلمانوں اور چھوٹی اقلیتوں کو رخصت و رخصت نہ سمجھتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دنیا نے جواہر لعل نہرو کو یہ کہتے سنا کہ برطانوی حکومت اور کانگریس کے سوا برصغیر میں کسی تیسری جماعت کا وجود نہیں اور کانگریس کا ایک معمولی رضا کار ہزاروں جناحوں سے برتر ہے۔ لیکن چند ہی سال بعد اسی دنیا نے یہ دیکھا کہ نہرو گاندھی اور دوسرے کانگریسی لیڈر قائد اعظمؒ کے در دولت پر دستک دے رہے تھے۔ یہ سب کچھ اسلام کے سبب جلیل کے یقین محکم اور ایمان کا نتیجہ تھا۔

”قرارداد پاکستان“ کے بعد قائد اعظمؒ کا مطمح نظر صرف یہی تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں

کی آخری منزل پاکستان ہے۔ اب ان تقریروں، تحریروں، ملاقاتوں کا مقصد پاکستان کا قیام تھا اور بس۔

(نقوش، قائد اعظم)۔ مرتبہ پروفیسر رحیم بخش شاہین
قائد اعظم۔ مضمون سراج نظامی مرحوم صفحہ نمبر ۶-۷)

یہ تھی حضرت قائد اعظم کی شان، آن اور ایتقان، یہ تھا ان کا اعجاز قیادت و سیادت کہ پورے برصغیر میں کوئی بھی ایسا لیڈر نہیں تھا جو اس قدر واضح واضح، صاف صاف، ظاہر و باطن میں یکتا۔ حضرت قائد اعظم کے مقابلے میں گاندھی کا حقیقت پسندانہ سیاسی اور تاریخی تجربہ کیا جائے تو زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ ہمیں افسوس ہے کہ بین الاقوامی سطح پر جتنا گاندھی کا امیج بحیثیت ایک عظیم لیڈر اچھالا گیا، اتنی حضرت قائد اعظم پر توجہ نہ دی گئی، ہندوستان کی فلم ”گاندھی“ دیکھنے کے بعد جو عمومی تاثر پیدا ہوتا ہے وہ یہ کہ گاندھی جی کو برصغیر کی تقسیم کا محور اور مرکز دکھایا گیا اور حضرت قائد اعظم کی بحیثیت ان کے سیاسی کردار و عمل، ان کی بے مثال قیادت اور بھرپور قومی اور بین الاقوامی امیج کو ٹھیس پہنچائی گئی۔ لہٰذا فکریہ یہ ہے کہ ہم نے آج تک اس عظیم قائد کی روح کو پہچانا ہے اور نہ پہچاننے کی کوشش کی ہے۔ ہندوستان کے مقابلے میں حضرت قائد اعظم کے بھرپور سیاسی اور مثبت کردار پر ایک عظیم الشان فلم بنائی جانی چاہئے تھی جو بین الاقوامی سطح پر پورے برصغیر کی تقسیم کے اصل حقائق کو واضح کر سکتی۔ لیکن شوائے قسمت ہماری قوم کے اداروں اور قومی اور حکومتی اداروں، متمول افراد قوم کی ترجیحات کیا ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہ سب کچھ واضح ہے، قیام پاکستان کے بعد استحکام پاکستان کا فریضہ غیروں نے تو نہیں ادا کرنا، بہر حال یہ مسلمانان پاکستان کا فرض ہے۔ کاش کہ وہ اس عظیم مقصد کی پہچان پیدا کریں۔ جو کام اور جتنا کام حضرت قائد اعظم کی پروقاہ زندگی، ان کی ولولہ انگیز قیادت ان کی خدا داد صلاحیتوں پر کتب اور مواد چھیننا چاہئے تھا، کچھ بھی نہیں ہو رہا، اپنے ہی سیاسی اور قومی حالات و واقعات کے گرداب سے نہیں نکل پارہے تو پاکستان کی تعمیر و استحکام کس طرح ممکن بنا سکتے ہیں۔

کون جیتا کون ہارا

ظہیر الاسلام فاروقی ایڈووکیٹ (مرحوم) (تحریک پاکستان گولڈ میڈلسٹ) نے اپنی کتاب میں گاندھی اور حضرت قائد اعظمؒ کی خط و کتابت کا ذکر یوں کیا ہے، جس سے واضح ہوتا ہے۔ کہ کون کہاں کھڑا ہے۔

مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ نے کانگریسوں میں ایک بل چل چاڑی، لیکن اس کے باوجود انہیں اپنے مسلمان کانگریسیوں پر بھروسہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ کلکتہ میں کانگریس کی مجلس عاملہ کا جو اجلاس ہوا اس کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو نے یہاں تک کہہ دیا کہ مسلم لیگ کے مقابلے میں کانگریس کو مسلمانوں کا بہت زیادہ اعتماد حاصل ہے۔ لیکن اندرونی طور پر کانگریسی اپنی ناکامی کا اعتراف کر رہے تھے۔ اس موقع پر گاندھی جی پھر مہاتما جی کاروپ دھار کر آگے آئے اور قائد اعظمؒ کو لکھا۔ ”لکھنؤ میں جو آپ نے تقریر کی ہے۔ وہ شروع سے لے کر آخر تک ایک اعلان جنگ ہے۔ میرا خیال تھا کہ دونوں جماعتیں مجھے ایک واسطہ خیال کریں گی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو یہ تجویز پسند نہیں، جس کا مجھے بے حد افسوس ہے۔ نزاع میں فریقین ہوتے ہیں۔ اگر میں آپ میں صلح نہ بھی کر اسکو تو پھر مجھے فریق نہ بنائیں گے۔

۱۵ نومبر ۱۹۴۷ء کو قائد اعظمؒ نے اس خط کے جواب میں تحریر کیا۔

”مجھے تعجب اور افسوس ہے۔ کہ میری لکھنؤ والی تقریر کو آپ اعلان جنگ سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ یہ قطعی مدافعتیہ تقریر تھی۔ ازراہ کرم آپ اسے دوبارہ پڑھیں اور اس کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ افسوس ہے کہ گزشتہ ایک سال میں جو واقعات رونما ہوئے ہیں۔ ان پر آپ کی نظر نہیں

ہے۔ یہ درست ہے کہ آپ کانگریس کے ابتدائی رکن بھی نہیں ہیں تاہم اس سے انکار مشکل ہے کہ کانگریس کی قیادت آپ کے ہی ہاتھ میں ہے۔ آپ نے جو مکتوب تحریر کیا ہے اس کے لئے شکر گزار ہوں۔ لیکن مجھے معاف کیا جائے۔ اگر میں یہ کہوں کہ اس میں کوئی مفید اور ٹھوس عملی تجویز نہیں ہے۔

اس کے تین ماہ بعد گاندھی جی نے قائد اعظم کو لکھا۔

آپ نے اپنے خط میں تحریر کیا ہے کہ آپ کی تقریر اعلان جنگ نہیں۔ لیکن آپ کے بعد کے بیانات میرے پہلے خیالات کی تصدیق کرتے ہیں۔ آپ کی تقریر میں ”پرانیشنلسٹ“ نظر انداز ہو گیا تھا۔ جب میں ۱۹۱۵ء میں جنوبی افریقہ سے واپس آیا۔ تو آپ ایک ہرگرم نیشنلسٹ تھے۔ ہر ایک آپ کو نیشنلسٹ ہی سمجھتا تھا۔ اور آپ ہندو اور مسلمانوں کی ایک امید تھے۔ کیا آپ وہی مسٹر جناح ہیں۔ ”اگر آپ اپنی تقریر کے باوجود بھی جناح ہیں۔ تو میں آپ کے الفاظ کو قبول کرتا ہوں۔ اس خط کے موصول ہونے کے بارہ دن بعد قائد اعظم نے جواب دیا۔ ”آپ نے لکھا ہے کہ میری تقریر سے ”قدیمی نیشنلسٹ“ کے جذبات مفلوج ہیں کیا آپ اپنے آپ کو ایسا کہنے میں حق بجانب خیال کرتے ہیں۔ میں کبھی یہ نہیں سوچتا، کہ لوگ ۱۹۱۵ء میں آپ کو کیا کہتے تھے۔ اور آج آپ کے متعلق کیا خیال کرتے ہیں۔ نیشنلسزم“ کسی کی اجارہ داری نہیں ہے اور ان ایام میں اس کی وضاحت بہت مشکل ہے۔ لیکن میں آئندہ مزید ایسے طریق خط و کتابت کو پسند نہیں کرتا۔“

(مقصد پاکستان۔ مصنفہ ظہیر الاسلام فاروقی، صفحہ نمبر ۲۵۰-۲۵۲)

میں نے پہلے صفحات میں کتاب ”مہاتما گاندھی ایڈسٹرگل فار سوراج“ کے مصنفین سین گپتا اور جی چودھری کا حوالہ دیا ہے۔ جس میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ مہاتما گاندھی یورپ اور انگلینڈ، جہاں جہاں گئے۔ انہوں نے انگریزوں کو اپنا نجات دہندہ، ہمدرد، گارڈین اور کنسٹوڈین تصور کیا اور ان کی عالی ظرفی اور ان کے ساتھ محبت کا بھرپور اظہار کیا۔ لیکن ہمیں ایسی بات اپنے قائد اعظم میں کہیں بھی نظر نہیں آتی۔ کہ انہوں نے بے عمل اور بے معنی بات یا بیان دیا ہو۔ اور پھر بعد میں اس کے عین برعکس عمل درآمد کیا ہو۔ ہر کیف گاندھی کے اس طرح کی شش جتنی شخصیت کے نمایاں آثار برصغیر کی تاریخ میں خاصے بکھرے پڑے ہیں۔ مگر اس کے باوصف ہندو دھرم کے پجاریوں اور ان کے ہمنواؤں نے انہیں سر پر اٹھائے رکھا اور بین الاقوامی سطح پر اس قدر پر دیکھندہ کیا کہ گاندھی کے بارے میں اصل حقائق تاریخ میں رقم نہ کئے جاسکے۔

چنانچہ برصغیر میں جب گاندھی نے ”ہندوستان چھوڑ دو“ کی تحریک چلائی تو وہی گاندھی پھر جلوہ افروز ہوتے ہیں اور انگریز دشمنی میں سب سے آگے۔ جناب ظہیر الاسلام فاروقی تحریر

فرماتے ہیں۔

کانگریس کا رد عمل

اتحادیوں کی ان مسلسل شکستوں سے کانگریسیوں کے گھروں میں گھی کے چراغ جلنا شروع ہو گئے، کیونکہ اب برطانیہ کے عروج کو گمن لگ رہا تھا۔ بہت سے کانگریسی لیڈروں کو گمان تھا کہ جاپان ہندوستان کو آزادی دلانے آرہا ہے۔ ہندوؤں کی یہ خوش فہمیاں اور جاپان سے ہمدردیاں ناقابل فہم نہیں تھیں۔ کیونکہ ملایا کے ہندو فوجی اسیروں نے جاپان کے زیر ہدایت آزاد ہند کے نام سے اپنی فوج منظم کر لی تھی۔ جس کا کمانڈر ان چیف ”بھاش چندر بوس“ تھا اور اس کو تشیر دی جا رہی تھی کہ جاپان کی رہنمائی میں آزاد ہند فوج ”مادر ہند“ کو آزادی سے ہمکنار کرے گی۔

گوئٹلبر نے اپنی ڈائری مورخہ ۵ مارچ ۱۹۴۲ء میں لکھا ہے۔

”بوس، ہندوستان کی Resistance برلن میں بیٹھ کر رہا ہے۔ لندن کو ابھی تک معلوم نہیں ہے کہ وہ کہاں روپوش ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اب تک اس راز کو ظاہر نہیں کیا۔ میری کوشش یہ ہے کہ وہ اسی طرح چھپا رہے۔ ہٹلر سے اس کی ملاقات کے بعد اسے ظاہر کیا جائے گا“۔

(Quit India By P.Lockner-P-135)

اس پس منظر میں ۱۱ مارچ ۱۹۴۲ء کو چرچل نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ ہندوستان میں وزارت جنگ کا مشن جائے گاجو وہاں کے قومی لیڈروں سے مل کر معلوم کرے گا کہ اس مایوسی اور تعطل کو ختم کرنے کے لئے کون سا قابل حل منصوبہ ہو سکتا ہے۔

عظیم اقدام

کرپس، تجاویز کی ناکامی نے کانگریس کو پریشان اور مایوس کر دیا تھا اس نازک موقع پر مسٹر گاندھی نے اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی ٹھانی اور تمام ملک میں سول نافرمانی کا پروگرام طے کیا تاکہ اس حربہ سے ایک ہی وار میں دو شکار ہو جائیں ایک طرف اپنے حسب فضا برطانوی حکومت سے سودا بازی کی جائے کہ وہ اپنے مطالبہ پاکستان سے دست بردار ہو جائے۔ کرپس کی ہندوستان سے فوراً واپسی کے بعد کانگریسی حلقوں سے ان سرگوشیوں کی سن گن آنے لگی کہ کانگریس ایک عظیم قدم اٹھانے والی ہے۔ یہ عظیم قدم ۱۴ جولائی ۱۹۴۲ء کو یوں ظاہر کیا گیا کہ گاندھی نے کھلے الفاظ میں کہا کہ

”ہندو مسلم اتحاد اور ان کے مسائل کا حل ہندوستان کی آزادی حاصل کرنے کے بعد ہو گا۔“ انہوں نے مزید وضاحت کی کہ جب تک اجنبی حکومت کا خاتمہ اور ہندوستان کو مکمل آزادی حاصل نہیں ہو جاتی اس وقت تک وہ پاکستان اور فرقہ وارانہ سوال پر بحث مباحثہ کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔“

اس کے بعد تمام ملک میں ”ہندوستان چھوڑ دو“ کا نعرہ بلند ہو گیا۔ کانگریس پسند سرکار نے ”قلم چھوڑ“ سڑائیک شروع کر دی۔ اس نے حکومت اور مسلم لیگ ہردو کو خوف میں مبتلا کر دیا۔ لیکن قائد اعظمؒ نے جون ۱۹۳۲ء کو بیان جلدی کیا۔

”جب تک کانگریس فریب دہی اور جھوٹے پروپیگنڈے پر کاربند ہے۔ ہندوستان کی ترقی خطرے میں رہے گی۔ اس دھمکی کا معذریہ یہ ہے کہ برطانیہ کو اس منہبست اور شکستہ حالت میں مجبور کیا جائے کہ وہ گاندھی کے مطالبہ کو تسلیم کرنے میں صرف اتنا کتنا چاہتا ہوں کہ برطانیہ کی یہ فاش غلطی ہوگی اگر اس نے کسی ایسے انداز میں کانگریس کے آگے سر جھکایا جو مسلم انڈیا کے لئے نقصان دہ ہو۔“

”ہمیں علم نہیں کہ یہ عظیم اقدام کیا ہونے والا ہے، ہمیں اپنی معینہ منزل حصول پاکستان کے مقصد سے کوئی چیز ہٹا نہیں سکتی“

(Two Nation Theory By Shafique Ali Khan. P-844)

مسٹر گاندھی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ اس جنگ میں جرمنی اور خصوصاً جاپان کی فتح یقینی ہے۔ ان کی رائے یہ تھی۔

”اگر جاپانی فوج کبھی ہندوستان میں داخل ہو بھی گئی تو وہ ہماری دشمن بن کر نہیں آئے گی۔ بلکہ حکومت برطانیہ کی دشمن کے طور پر آئے گی۔ اور اگر برطانیہ ہندوستان کو فوراً چھوڑ دے تو جاپان ہندوستان پر حملہ نہیں کرے گا۔“

(Two Nation Theory: Shafique Ali Khan P-844)

مولانا نے گاندھی کی سول نافرمانی کی مخالفت کی۔ اس سے گاندھی بہت پریشان ہوا۔ اور مولانا آزاد کو خط میں لکھا۔ ”اگر کانگریس ان کو (گاندھی) اپنا رہنما چاہتی ہے تو آپ کو کانگریس سے استعفیٰ دے دینا چاہئے“ بہر کیف بعد میں پٹیل نے دونوں میں صلح کرادی۔

آخر کار ۱۴ جولائی ۱۹۳۲ء کو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے وہ مشہور قرار داد ”ہندوستان چھوڑ دو“ پاس کر دی اور ۸ اگست ۱۹۳۲ء کو نافذ العمل ہو گئی۔

جب یہ قرار داد پاس ہو گئی تو مس میرابین کو کہا کہ وہ وائسرائے سے ملاقات کر کے اسے

نکار داد کی نوعیت اور اس کے عواقب سے آگاہ کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن وائسرائے نے اس بنا پر ملنے سے انکار کر دیا کہ چونکہ گاندھی نے حکومت ہند کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا ہے اس لئے وہ کسی دباؤ کے تحت گفتگو نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی کے تمام ممبران کو مع گاندھی گرفتار کر لیا گیا۔ اور باقی ماندہ عرصہ جنگ کے دوران احمد نگر کے قلعہ میں قید رہے۔

بحر حال قرار داد پر پوری شد و مد کے ساتھ عمل شروع ہو گیا۔ اور تمام برصغیر میں فتنہ و فساد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ حکومت نے اپنی پوری طاقت استعمال کی اور تمام آتش بغاوت کو ٹھنڈا کر دیا۔

تحریکِ سول نافرمانی اور اس کا انجام

یہ باغیانہ تحریک بڑی طرح ناکام ہوئی بلکہ ذلت کے ساتھ گاندھی کے سب اندازے غلط نکلے۔ حکومت نے باوجود اس کے کہ عالمی جنگ کے محاذ پر اطمینان بخش صورتِ حال نہ تھی۔ کانگریس سے ازروہ تکلف بھی بات کرنا پسند نہ کیا کانگریس کے خود اپنے تخمینے کے مطابق اسے حسب ذیل نقصانات اٹھانے پڑے۔ ۶۰۲۲۹ افراد گرفتار ۱۸۰۰۰ اشخاص ڈیفنس آف انڈیا رولز کے تحت نظر بند ۹۴۰ پولیس یا فوج کے ہاتھوں ہلاک، فوج یا پولیس کی گولیوں سے زخمی افراد ۱۶۳۰، ۶۰ جنگوں پر فوج بلائی گئی۔ ۵۳۸ مواقع پر پولیس نے گولیاں چلائیں اور ہجوم کو منتشر کرنے کے لئے ہوائی جہازوں کا استعمال ہوا۔

قائد اعظمؒ کا ردِ عمل

”ہندوستان چھوڑ دو“ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۴۲ء کو قائد اعظمؒ نے اس باغیانہ تحریک کو انگریز کی نسبت زیادہ تر مسلمانوں کے خلاف قرار دیا۔ گاندھی نے ستمبر ۳۹ء میں وائسرائے سے مذاقات کے دوران جنگ میں غیر مشروط امداد کی پیش کش کی یاد دہانی کرائی۔ اور پھر فوراً ہی بعد میں اپنے الفاظ سے پھر گیا اور ہندوستان کی آزادی کے فوری اعلان کئے جانے کا مطالبہ کر دیا۔ جب یہ مطالبہ ٹھکرا دیا گیا تو کانگریسی وزارت کو مستعفی ہونے کے لئے کہا گیا پھر انفرادی سیبتہ برہ کرنے کی مہم شروع کر دی جس میں ہزاروں افراد کو گرفتار کر لیا گیا اور آخر میں کرپس مشن کی ناکامی کے بعد اس نے علانیہ بغاوت کا راستہ ہموار کر لیا۔ حالانکہ اس سلسلہ میں کسی پارٹی سے بھی شورہ نہیں کیا گیا۔ حتیٰ کہ چوٹی کے کانگریسی لیڈروں کی مخالفت کو بھی درخورِ اعتناء نہ سمجھا

گیا۔

قائد اعظمؒ نے فرمایا۔ ”کانگریس ورکنگ کمیٹی کا یہ فیصلہ کہ اگر برٹش گورنمنٹ ہندوستان سے فوراً دستبردار نہیں ہوگی تو عوامی تحریک چلائی جائے گی۔ یہ گاندھی اور اس کی ہندو کانگریس کی پالیسی کا نقطہ عروج ہے کہ اس طرح برٹش گورنمنٹ کو مجبور کیا جائے کہ وہ اقتدار اس حکومت کے سپرد کر دے جو انگریزی تلوار کی سرپرستی (پناہ) میں ہندو راج قائم کر دے اور اس طرح مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو ہندو راج کے رحم و کرم پر چھوڑ دے۔“

برٹش گورنمنٹ نے ایک لمحہ کی تاخیر کئے بغیر سختی کے ساتھ اس تحریک کو کچل کر رکھ دیا جس مایوسی، غمگین اور اختلافی مشوروں سے ”ہندوستان چھوڑ دو“ کی تحریک اور قرار داد کو معرض وجود میں لایا گیا تھا اتنی ہی شدت کے ساتھ کانگریس کی انانیت خاک بسر ہو گئی۔“

(مقصد پاکستان مصنفہ ظہیر الاسلام فاروقی صفحہ نمبر ۲۷۱ - ۲۷۴)

بیرونی نکلسن نے جن نظریات و خیالات کو پیش کیا ہے۔ اس سے حضرت قائد اعظمؒ کی ایک انتہائی بلند بالا اور قد آور شخصیت ابھر کر سامنے آتی ہے۔ کہتے ہیں کہ جادو وہ جو سرچڑھ کر بولے۔ بیرونی نکلسن لکھتے ہیں۔“

اب جب کہ جنح اس دنیائے فانی میں نہ رہے، کیا ہو گا؟

دو صورتوں کا میرے خیال میں مسلمہ طور پر یقین کر لینا چاہئے

پہلا یہ کہ پاکستان پر اس کی مضبوط ہمسایہ حکومت شب و روز حملہ آور ہوگی۔ رشوت سے، دھمکیوں سے اور ممکن ہے غیر ممکن طریقے سے ہندوستان اس کی معاشی، اخلاقی اور اقتصادی بنیادیں ہلانے کی کوشش کرے گا۔ دوسری یہ کہ پاکستان ان تمام حملوں کا مقابلہ مردانہ وار کر سکے گا۔ اس نے دنیا کے نقشہ پر آنا ہی تھا۔ وہ دنیا کے نقشہ پر رہے گا۔ نہ صرف اس لئے کہ وہ جغرافیائی اعتبار سے ایک ملک کھلانے کا مستحق ہے۔ بلکہ اس سے بھی کہیں زیادہ پاکستان ایک قوم کا وطن ہے۔ اور قوم بھی دنیا کی بڑی قوم، اور اس ملک کو عالم وجود میں لانے والا شخص ایک روز اپنے حریفوں سے بھی خراج تحسین لئے بغیر نہیں رہ سکے گا اور اسے تاریخ عالم میں ایک بہت اونچی اور نمایاں جگہ دینی پڑے گی۔

مستر جنح کی وفات کے چند گھنٹے پہلے ہفتہ کو مجھے ان کا ایک مکتوب مورخہ ۳ ستمبر ملا، جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ۔

”آپ کو معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہے۔“

لیکن اس خط میں ان کے دستخط اس قدر کانپتے ہوئے ہاتھوں سے تھے کہ تقریباً سمجھ نہیں

میں آتے تھے۔ یہ دستخط صاف و خوشخط اور ان دستخطوں سے قطعی مختلف تھے جو انہوں نے ۱۹۴۸ء میں اس مسودہ پر کئے تھے کہ جس میں میرے کئے پر پہلی مرتبہ انہوں نے پاکستان کے -حاشرتی اور اخلاقی اصولوں کو واضح کیا تھا۔

اس وقت مجھے خیال آیا تھا کہ یہ شخص کب تک زندہ رہے گا اور اس کے بعد کیا ہو گا؟ وہ ایک مشرقی غیر معمولی، قابل ہستی تھے۔ سیول رو کے سلعے ہوئے کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ان کا باغ اس قدر تیز اور زود فہم تھا کہ جتنا گاندھی کا، مگر اس وقت جب کہ بمبئی کی تیز گرمی میں گاندھی نے سوت کی لنگوٹی پہنی، وہ بہترین سوٹ پہنے رہتے۔ ان کا کار سفید اور سخت ہوتا، اور ان کی لیکھ -نیشے والی عینک، ان کے واسکٹ کی جیب پر چپکتی ہوتی اور مقابلتاً دونوں آدمیوں میں وہ زیادہ صابر اور سرد مزاج معلوم ہوتے۔ ان کی مالا بارہل کی کوٹھی میں جو بمبئی کی سب سے زیادہ -حنڈی جگہ ہے۔ ملاقات کرنا حقیقت میں مشرق سے مغرب کی فضا میں پہنچ جانا تھا کوٹھی کے اندر -بانے والی سڑک پر دونوں طرف یورپی پھولوں کی قطاریں تھیں۔ ہال میں اوک کی پرانی لکڑی کا -سامان تھا ان کے مطالعے کے کمرے میں میز پر ایک چاندی کے ڈبہ میں انگریزی ہاضم بہکت رکھے ہوئے تھے۔ اور ٹائمر کا تازہ پرچہ کھلا پڑا تھا۔ کمرہ کی الماریاں ایسی عمدہ اور مخصوص کتابوں سے پر تھیں کہ جو ایک انگریز لارڈ چانسلر کے کتب خانہ کو بھی شرماتی تھیں۔

انہیں الماریوں میں سے ایک روز انہوں نے ایک کتاب ”جان برائٹ کی تقریریں“ جس میں اس بڑے مقرر نے نوے سال پہلے ایک تقریر کرتے ہوئے دارالعوام میں یہ کہہ کر ہانچل مچادی تھی کہ ”کیا کوئی شخص جو ایک شمشہ بھر بھی عقل و دانش رکھتا ہے یقین کر سکتا ہے کہ ہندوستان جو چالیس قوموں پر مشتمل ہے اور جس میں چالیس مختلف زبانیں رائج ہیں۔ ایک ملک بن کر ایک -سلطنت میں شامل ہو سکتا ہے۔ میں اس چیز کو قطعی غیر ممکن سمجھتا ہوں۔“

مسٹر جناح بھی اسے غیر ممکن خیال کرتے تھے، انہوں نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا، ”برائٹ نے جو اتنے عرصے پہلے کہا تھا وہ اب اور بھی زیادہ صحیح ہوتا جا رہا ہے۔ صرف فرق یہ ہے کہ زور چالیس مختلف قوموں پر نہیں دیا جا رہا ہے۔ بلکہ دو مختلف قوموں پر، ہندو اور مسلمان، انہوں نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا ”زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نہیں ہے جو ہم دونوں کو وابستہ کر سکتا ہو ہم دونوں قطعی مختلف انسان ہیں“

کیا میں اخبارات میں آپ کے اس نظریہ کو شائع کر سکتا ہوں، میں نے پوچھا۔ ”یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ اس کی اشاعت کریں، ہمارے نام، ہمارا لباس، ہمارا کھانا یہ سب مختلف ہیں، ہماری -حاشرتی زندگی، ہمارے تعلیمی خیالات، ہمارا عورتوں سے سلوک، ان سب باتوں پر ہم ایک

دوسرے کے بالکل متضاد ہیں۔ اور زندگی کے قطب نما کے ہر پہلو پر ہم ایک دوسرے کو چیلنج کرتے ہیں۔“

یہ مسٹر جناح کا وہ مستحکم نظریہ تھا جو تاریخ عالم میں ایک ضروری جزو سمجھا جائے گا۔ اس نظریہ کو چار لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کا وجود نہیں ہے۔ اس کا وجود کبھی نہیں تھا، کبھی نہیں ہو گا، یہ انگریزوں کا تیار کردہ ایک کھیل تھا اور جب ہی تک یہ رہے گا، جب تک انگریز رہیں گے۔

یہ کھرا نظریہ بہت سے لوگوں کو برا لگا۔ انگریز لبرل اس لئے ناراض ہو گئے کہ انہوں نے زندگی کا بہتر حصہ ان دونوں قوموں کو ایک کرنے کے لئے (چاہے کاغذ پر ہی ہو) صرف کیا تھا، ہندو نے پہلے سے بھی زیادہ حقارت سے نظر ڈالی۔

گاندھی کے چیلوں میں سے تعلیم یافتہ اور سنجیدہ لوگوں کا یہ خیال ضرور تھا کہ وہ مذہبی تناؤ کو نرم کریں اور وہ اس مذہبی پاگل پن پر افسوس کرتے تھے، وہ چاہتے تھے کہ صورت ایسی نکل آئے کہ جس سے ان دونوں قوموں میں تعاون کی صورت پیدا ہو جائے، اور وہ اس میں برابر کوشاں تھے۔ مگر جناح ان سے کوئی تعاون نہیں کرنا چاہتے تھے، کیا ہندو، ان کا کہنا تھا، مسلمانوں سے تعداد میں تین گنا نہیں ہیں؟ کیا ان کے پاس کہیں زیادہ دولت، کہیں زیادہ زمین اور کہیں زیادہ تجارتی دماغ نہیں ہے؟ کیا یہ واضح نہیں ہے کہ اگر انہوں نے، ایک ہندوستان کے نظریہ کو منوالیا تو وہ بہت جلد ہی حکومت پر قابض ہو جائیں گے۔ اور اس قیمتی سر زمین پر اپنی واحد حکومت کے لئے مسلمانوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کی کوشش نہیں کریں گے اور ان کو نیست و نابود کرنا چاہیں گے؟ کم از کم اس کا جواب لفظ ممکن میں ہو سکتا تھا۔ مسٹر جناح نے وہ سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ جو مسلمان اقلیتوں پر ہندو مجارٹی راج میں ہوا، وہ ہندو نظریے جو انہوں نے گاندھی کی درویشانہ شکل کے پیچھے ہر وقت مسلم اقلیت کی طرف بھینک صورت میں دیکھتے ہوئے اندازہ کئے تھے۔“

(مقصد پاکستان مصنفہ ظہیر الاسلام فاروقی صفحہ نمبر ۳۶۵ - ۳۶۴)

جناب پروفیسر منور مرزا تحریر کرتے ہیں۔ ”حضرت قائد اعظمؒ کو خدائے وحدہ لا شریک نے بچپن سے ہی کچھ اہم ذمہ داریوں اور فرائض کی تکمیل کے لئے پروان چڑھایا تھا۔ جی الانہ صاحب اپنی کتاب (قائد اعظم..... ایک ملت کی داستان) میں لکھتے ہیں۔ کہ قائد اعظمؒ کا گھرانہ کوئی مذہبی گھرانہ نہیں تھا، وہ سیدھے سادھے مسلمان لوگ تھے، بھولے بھالے عقائد کے مالک بزرگوں کی مری مٹی پر حاضری دینے والے لوگ تھے، اور قائد اعظمؒ کی پرائمری تعلیم بھی ایک اسلامی مدرسے سے ہوئی۔“ جب آپ انگلستان میں بیرسٹری کے لئے تشریف لے گئے تو وہاں

نسوں نے ننگنزان جیسے ادارے کو اپنی تعلیم و تربیت کے لئے اس لئے پسند کیا کہ اس ادارے کی یوزھی والی کوس پر عالم انسانیت کو آئین و دستور سے نوازنے والوں کے جو نام درج تھے۔ ان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم مبارک بھی درج تھا۔

حضرت قائد اعظمؒ کو آغاز کار میں کوئی غیر معمولی ملازمت بھی حاصل نہ ہوئی تھی، ان کے گھریلو ماحول میں کوئی بلند و بالا علمی، دینی اور سیاسی شخصیت کی مثال بھی نہیں تھی۔ ان کی تعلیم و تدریس کے دوران بھی کسی بڑی ہستی کا کردار شامل نہیں تھا۔ انہوں نے دیانت و امانت کے انہری اصولوں کے لئے کبھی بھی بزرگان دین سے براہ راست روشنی حاصل نہ کی تھی۔ لیکن اس کے باوجود صف ان کا رخ سیدھا بلکہ تیر قضا کی طرح سیدھا رہا اور وہ بلندیوں کی طرف مائل پہ پھوڑا ہے۔

علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں۔

وہی ہے صاحب امروز جس نے اپنی ہمت سے

زمانے کے سمندر سے نکالا گوہر فردا!!

جب مانڈیگو چیمفورڈ سکیم کے ضمن میں وزیر ہند مسٹر مانیٹگو ہندوستان آئے تو انہوں نے ہندوستان کے اونچے اور چوٹی کے سیاست دانوں سے ملاقات کی۔ جن میں تلک، گوکھلے، دادا بھائی نوروجی اور محمد علی جناح شامل تھے۔ مسٹر مانیٹگو نے اپنی ڈائری میں محمد علی جناح کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کچھ اس طرح سے کیا ہے۔ ”ایک صاف ستھرا، انتہائی سلیقہ مند نوجوان، جس کی چال ڈھال دل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ منطقاً نہ گفتگو کا ماہر، اپنی بات کو ٹھیک طور پر منوانے کا عموماً دار، وہ اپنی رائے میں کسی ترمیم کا روادار نہ تھا۔ اگر ان کی پوری اور مکمل بات تسلیم نہ کی جائے۔ تو آدھی بات منوانے کے لئے کبھی راضی نہ ہوتے تھے۔ میں نے ان سے باتیں کیں، ان سے شکست کھا گیا، جب لارڈ چیمفورڈ نے ان سے گفتگو کی۔ تو جناح کی قوت استدلال نے انہیں جواب کر دیا۔ وہ ایک انتہائی ذہین شخصیت ہے جناح جیسے انسان کو نظام حکومت میں شامل نہ کرنا اس سے بڑی حقوق کی پامالی اور کیا ہو سکتی ہے۔“

حضرت قائد اعظمؒ کو خدا تعالیٰ نے ایک وسیع قلب عطا کیا تھا۔ اور ان کی شخصیت کو انسانی ہمت و کردار کا دائمی نمونہ عمل بنایا۔ جن کا صحیفہ حیات اور اس کے تمام حصے ہماری نظروں کے سامنے ہیں۔ حضرت قائد اعظمؒ کی زندگی کا کوئی واقعہ پردہ راز میں نہیں۔ ان کی سوانح اور حالات زندگی روز روشن کی طرح دنیا کے سامنے ہیں۔ ان کی چال ڈھال کھری، بات چیت کھری۔ صالح و نیکو کھرا اور ان کی سیادت و قیادت کھری۔ انداز گفتگو نکھرا اور طرز مخاطب بے عیب

— ہیرا پھیری، مکرو فریب، سیاسی جمناسٹک، دوغلی پالیسی، ظاہر و باطن کی جنگ، ان کی شخصیت میں شامل ہی نہیں تھی۔ انہیں تو اپنے مشن کے ساتھ سچا اور پکا لگاؤ تھا اور مسلمانان ہند کی فلاح و بہبود اور آزادی و خود مختاری کے ساتھ عشق۔

سر آغا خان اپنی خود نوشت سرگزشت میں لکھتے ہیں ”مجھے اپنی زندگی میں جن ممتاز سیاسی مدیرین کو اچھی طرح سے جاننے کا موقع ملا۔ ان میں کلے منبیشیو، لائڈ جارج، چرچل، کرزن، موسولینی اور مہاتما گاندھی شامل ہیں۔ ان میں جناح سب سے زیادہ منفرد اور نمایاں تھے۔ ان میں سے کوئی مضبوطی کردار میں جناح کا ہم پلہ نہیں تھا۔ دراصل جناح میں وقت نظر اور عزم و استقامت کے اوصاف بدرجہ اتم ہم آہنگ تھے۔ اور یہی حقیقی سیاست ہے“ —

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جو آنکھ ہی سے نہ چپکے تو وہ لہو کیا ہے

حضرت قائد اعظمؒ برصغیر میں ایک نہ ملنے والا پہاڑ تھے۔ ہندو اور انگریز کے لئے استقامت و استقلال کا بحریکراں تھے۔ روحانی قوت و استعداد سے علو، ایک نحیف و زرار، مگر پاکیزہ فکر اور پاکیزہ روح والا انسان۔ جنہوں نے اپنی قوم کو ہمیشہ زندہ روح پیدا کرنے کی تلقین فرمائی۔ بیسویں صدی کے جتنے بھی قائدین قرطاس سیاست پر ابھرے ہیں۔ ان تمام میں حضرت قائد اعظمؒ کی مثال بے مثال ہے۔ ان کی قدر و منزلت بے پایاں ہے۔ تاریخ میں ایسے قائدین کم ہی پیدا ہوتے ہیں۔

وہ قائد اعظمؒ جن کے بارے میں ماؤنٹ بیٹن نے تقسیم ہند کے وقت یہ کہا تھا کہ ”برطانوی حکومت کا منشا یہ تھا کہ ہندوستان متحد رہے۔ لیکن ایسا صرف قائد اعظمؒ کی وجہ سے نہ ہو سکا۔ انہوں نے اپنے انٹرویو میں کہا ہے۔

• ”مجھے صرف اس مقصد کے لئے ہندوستان بھیجا گیا تھا۔ کہ میں اس ملک کو کسی نہ کسی طریق سے متحد رکھوں اور متحدہ ہندوستان ہی کو اقتدار منتقل کروں، ہم دو سال کے بعد اس عظیم ملک کو چھوڑ رہے تھے اگر ہم اسے متحدہ ہند کی صورت میں چھوڑنے میں کامیاب ہو جاتے تو یہ اٹلی گورنمنٹ کا تاریخی معرکہ ہوتا، ہندوستان کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا میرے نزدیک ایک الم انگیزہ حادثہ تھا۔ جس سے اس متحدہ ملک کی قوت پارہ پارہ ہو گئی تھی۔ میں نے اس مقصد کے لئے بھرپور کوشش کی۔ دن رات ایک کر دیئے، راتوں کی نیند حرام کر دی۔ لیکن میرے اس مقصد کی راہ میں ایک ہی شخص حائل تھا۔ جو پہاڑ کی طرح رکاوٹ بنے کھڑا تھا، جو چٹان کی طرح میرے مقصد میں سدراہ تھا۔ اور وہ تھا ”قائد اعظمؒ“۔ مسٹر محمد علی جناح صدر آل انڈیا مسلم لیگ — ماؤنٹ

بیٹن نے محض اس خیال سے کہ ”میں اب عمر کے آخری دور میں داخل ہو گیا ہوں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں۔ اس عمر میں غلط بات نہ کہوں گا۔“ قائد اعظمؒ کے بارے میں کہا۔

”میں تمام سیاسی زندگی میں جس شخص سے سب سے زیادہ متاثر ہوا، وہ مسٹر محمد علی جناح کی ذات اور شخصیت تھی۔ اس میں میں نے منافقت کا شائبہ تک نہ دیکھا، اتنا بلند کردار انسان اور قومی لیڈر شاید ہی مسلمانوں کو دوبارہ ملے۔“

(ملت کا پاسبان - مصنفہ پروفیسر کرم حیدری دیباچہ)

تحریک پاکستان کے ابواب سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ گاندھی اور نہرو آخری وقت تک تقسیم ہند کے سخت مخالفین میں سے تھے۔ اور ان کی دیرینہ خواہش بھی یہی تھی۔ کہ حکومت جس طرح کی ہے۔ جیسی ہے، انگریز انہیں عطا کر جائے۔ سردار پٹیل نے گاندھی سے کئی مرتبہ کہا۔ کہ ”مہاتما جی! یہ تقسیم ہو کر رہے گی، بے سود نگرین نہ مارو، اس لئے کہ مسلمانوں کو ایک ایسا عظیم قائد میسر آ گیا ہے جو انتہائی قابل ہے اور ناقابل خرید بھی“ — یہ قائد اعظمؒ کے کردار کا رعب اور دبدبہ تھا کہ انہوں نے کئی مرتبہ پٹیل اور نہرو کو (Incorrigible) ”ناقابل درست“ کہا۔ ان میں صاف بات کہنے کا خدا داد ملکہ حاصل تھا۔ نیت اور ارادہ درست ہو تو خدا تعالیٰ برکت بھی دیتا ہے۔

جب حضرت قائد اعظمؒ نے ۱۹۴۶ء میں راست اقدام کا فیصلہ صادر فرمایا تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کانگریسی اخبار ”بلٹن“ نے یوں لکھا تھا کہ ”مسلم لیگ کے بدترین دشمن بھی مسٹر جناح کی لیڈر شپ کو رشک کی نگاہوں سے دیکھنے پر مجبور ہوں گے، لیگ نے پچھلے ہفتے جو عظیم انقلابی فیصلہ کیا ہے اس سے ہمارے دلوں میں بے ساختہ یہ آرزو ابھرتی ہے کہ کاش! انڈین نیشنل کانگریس میں جناح جیسے مسلم الثبوت تدبیر کا ماہر کوئی اور لیڈر ہوتا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسٹر جناح کے فیصلے نے انگریز اور کانگریس دونوں کو بوکھلا کر رکھ دیا ہے اور اس عامیہ الزام کی دھجیاں بکھیر دی تھیں کہ مسلم لیگ برطانوی استعمار کی پروردہ جماعت ہے۔“

ایک ہندو لیڈر نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔ ”یہ دیکھ کر دل میں مسرت کی ایک لہر دوڑ اٹھتی ہے کہ ہندوستان میں مسٹر جناح کی قامت اور دیانت کا کم از کم ایک لیڈر تو ایسا تھا جس میں اس قدر شرافت و صداقت اور بے باکی تھی کہ اس نے انگریز وائسرائے کے منہ پر کہہ دیا کہ وہ اسے کیا سمجھتا ہے جب کہ باقی ہندو ساتھی لیڈر جن میں کانگریسی ہائی مکن کے لیڈر بھی شامل تھے، وائسرائے کو بہترین انگلش جنٹلمین اور بہترین عیسائی جنٹلمین جیسے خطابات سے نواز کر اس کی چالپوسی کر رہے تھے۔“

اس تعریف کا پس منظر یہ تھا کہ ہندوستان کے وائسرائے لارڈ سنٹھکھم جو اپنے رعب و ندبہ کے لئے مشہور تھے، انہوں نے کونسل مقرر کی اور اس میں مسلم لیگی وزراء، مولوی فضل الحق اور سر سکندر حیات خان کو بھی شامل کر لیا۔ قائد اعظم نے وائسرائے کے بائیکاٹ کا فیصلہ کیا اور ان دونوں حضرات سے کہا کہ وہ کونسل سے مستعفی ہو جائیں۔ جب وائسرائے کو اس کا علم ہوا تو اس نے قائد اعظم کو ملاقات کے لئے بلا بھیجا۔ ملاقات کے لئے ۱۱ بجے صبح کا وقت مقرر تھا۔ لیکن قائد اعظم ٹیلی فون پر بار بار یاد دہانی کے باوجود سوا گیارہ بجے سے پہلے وائسرائے کی لاج نہ پہنچے۔ وہاں جا کر بغیر کسی معذرت کے وائسرائے سے ملاقات کا مقصد پوچھا۔ اس نے کہا کہ آپ کو میرے بیان سے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں۔ قائد اعظم نے اس کے جواب میں کیا کہا۔ آپ کھڑے ہو گئے۔ اور وائسرائے سے یہ کہتے ہوئے کہ ”مجھے آپ کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں“ اور کمرے سے باہر چلے گئے۔

(حسن کردار کا نقش تابدہ - مصنفہ غلام احمد پرویز، صفحہ نمبر ۲۸)

ایچ ڈی ہوڈسن، جس نے ”گریٹ ڈیوائڈ“ The Great Divide نامی کتاب اس لئے لکھی تھی کہ وہ ماؤنٹ بینن کے کردار کو اجاگر کرنا چاہتا تھا، اپنی اس تصنیف میں قائد اعظم کے خلاف اپنے تعصب کو چھپانے میں ناکام رہا، لیکن اس کے باوجود وہ قائد اعظم کے بارے میں لکھتا ہے۔ ”ہندوستان کے آزادی کے نئے جنم کے آخری ڈرامہ میں تمام شخصیتوں سے زیادہ پراسرار اور اہم شخصیت محمد علی جناح کی ہے، انسان اس ڈرامے کو بڑے کرداروں میں (گاندھی کو شمار کئے بغیر جو سٹیج کے بازوؤں سے صرف دھماکہ خیز اور نامکمل انداز میں آتا ہے) پھر کردار کی جگہ کسی دوسرے کردار مثلاً کسی مختلف کانگریسی رہنما کا کسی دوسرے بڑے صوبہ یا بڑی ریاست کا فلاں یا فلاں مفاد یا فرقے کے کسی اور نمائندے بلکہ کسی دوسرے وائسرائے کا بھی۔ بغیر اس خیال کے کہ اس سے آخری صورت حال میں کوئی شدید فرق پڑ سکتا ہے۔ تصور کر سکتا ہے۔ لیکن یہ بات مشکل سے تصور میں لائی جاسکتی ہے کہ واقعات میں کوئی اہم تبدیلی واقع ہو سکتی ہے۔ یا آخری معرکہ تین کی دوہم پہلے حریفوں میں ہوتا۔ یا پاکستان کی نئی ریاست کی تخلیق ہو سکتی۔ اگر مسٹر جناح کی شخصیت اور سیاسی رہنمائی کا قدم در میان نہ ہوتا۔“ آگے چل کر ہوڈسن مزید لکھتا ہے کہ ”ایک بات یقینی ہے۔ وہ (جناح) کسی پست مقصد کے لئے نہیں بدلے ان کے بدترین سیاسی حریفوں نے بھی ان پر بددیانتی یا ذاتی مطلب براری کا الزام کبھی نہیں لگایا۔ انہیں کوئی شخص بھی کسی قیمت پر خرید نہ سکتا تھا۔ نہ ہی وہ ذرہ برابر بھی ہوا کے رخ پر چلنے والے مرغ باد نمٹتے۔ جو عوامی ہر دعویٰ کی ہوا میں ادھر ادھر بھٹکتا پھر رہا ہو یا وقتی مواقع سے فائدہ اٹھانے والے تھے، وہ

ایک ثابت قدم، نظریہ، پسند اور نہایت محتاط انا پرست تھے۔ —

(The Great Divide By: H.V. Hodson P-37:38)

ماخوذ از ملت کا پاسپان۔ مصنف پروفیسر کرم حیدری۔ (دیباچہ)

یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ حضرت قائد اعظمؒ کی تمام تر زندگی کو جس زاویے، جس نچ اور اس انداز سے بھی پرکھیں۔ تجزیہ کریں یا مطالعہ کریں تو جو بھی نتیجہ برآمد ہوگا، وہ ایک محور پر ایک ہی مرکزی ترجمانی کرے گا اور وہ مرکز و منبع اور محور ہے خدا تعالیٰ کی ذات پر قائد اعظمؒ غیر متزلزل ایمان و ایقان اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات اقدس سے بھرپور عقیدت، یقین کا یقینی اور کوئی حتمی سبب ضرور ہے۔ حضرت قائد اعظمؒ کو خدا تعالیٰ نے بچپن سے ہی ایک خاص مقصد عظیم کے لئے تیار کرنا شروع کر دیا تھا، میں یہ بات بڑے وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ خدا تعالیٰ نے بیسویں صدی میں دنیائے سیاست میں ان سے بڑا انسان پیدا نہیں کیا جس نے تخلیق پاکستان کو بیسویں صدی کے بہت بڑے سیاسی کارنامے اور معجزے کے طور پر دنیا کے سامنے پیش کیا۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔

جناب پروفیسر محمد منور مرزا تحریر کرتے ہیں۔ ”ہندو شوال نامی صاحب قلم نے اپنی کتاب ”ہندوستان کی نادان حکمران“ میں ذکر کیا ہے کہ گاندھی جی نے جنوری ۱۹۱۵ء سے لے کر یعنی تقریباً ۱۹۱۵ء سے واپس آنے کے وقت سے لے کر تادم وفات قوم کا کھایا۔ ان کی بکریاں بھی ان پر پلتی رہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو بیسویں صدی کے دوسرے دہاکے میں سیاست میں داخل ہوئے اور کانگریس سے تنخواہ لینے لگے۔ وہ ہر دوسرے تیسرے سال کے بعد اپنے ٹی اے، ڈی اے اور تنخواہوں کی رقم بڑھائے جانے پر اصرار کرتے تھے۔ انہوں نے کتابوں کی رائٹنگ جو کئی لاکھ روپے سالانہ تھی اندراپی کے نام منتقل کر دی۔ بہن کو محروم کر دیا۔ راجندر پرشاد صدر عمارت سرکاری خزانے سے ”خاطر داری جھنڈہ“ اتنا ہی نکلاتے تھے۔ جتنا منٹ بین اور ویول نکلاتے تھے مگر خرچ اس سے پچاس روپے بھی نہیں کرتے تھے۔ شوال نے مذکورہ بالا کتاب میں اندرا گاندھی کی نادانیوں پر مشتمل ہے۔ یہ بھی قلمبند کیا ہے کہ سردار پٹیل نے وزیر بن کر کیا کیا ناہ خرچی فرمائی۔

صدر بھارت مسٹر گری نے کس کس بے امنی کا ارتکاب کیا، اب سب تذکروں کے بعد وہ تل خود ہندوستان کے دشمن اول یعنی مسٹر جناح کا ذکر کرتا ہے۔ جب ہمارے قائد اعظمؒ کا سر چلتا ہے تو شیوال مجبوراً کہتا ہے کہ مسٹر جناح نے تمام عمر محنت کی، مشقت کے دم سے خوب دولت کمائی اور اس دولت کو قوم کے کاموں پر خرچ کیا اپنی ذات پر بھی اور

عزیزوں پر بھی، قوم سے کبھی کچھ نہ لیا اور نہ مسلم لیگ سے، اور پھر بہت سی رقم وقف کر گئے۔
 بہنوں کا حصہ الگ ادا کیا، بہت سے پاکستانی اور ہندوستانی تعلیمی اداروں کے لئے رقم مخصوص
 کیں۔ شیوال جیسا کہ ظاہر ہے، ہندو ہے، اندرا گاندھی پر یہ کتاب ۱۹۷۷ء میں قلمبند کی تھی۔
 اسے کہتے ہیں جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ قائد اعظمؒ کی قیادت ہمارے لئے مثال ہے محنت،
 خلوص، استقامت، اصول پسندی اور ایثار کی۔ قائد اعظمؒ کے سیاسی اخلاف اگر دیانت دار اور ایثار
 پیشہ ہوتے تو مسلم لیگ ایک طاقتور سیاسی جماعت ہوتی۔ پھر وہ طاقتور اور منظم جماعت بڑے بہت
 آدمی انتخابات کے لئے نامزد کرتی جو اہم کام کرنے کے اہل ہوتے منتخب ہو کر آنے والے اکثریت
 وہی لوگ نہ ہوتے جو دولت کے زور اور برادری کی قوت کو مکمل رسہ گیری کے سہارے اسمبلیوں
 میں پہنچ جاتے ہیں۔ جن کو نہ کوئی قومی شعور میسر ہوتا ہے اور نہ انہیں وطن کے احوال سے کوئی
 غرض ہوتی ہے، کیا یہ حقیقت نہیں کہ وہ لوگ بالعموم اپنی ”ٹوہر“ بنانے کے لئے آتے ہیں اور اکثر
 کے پیش نظر انتخابات پر خرچ ہونے والی بھاری بھر کم رقم کو واپس وصول کرنا ہوتا ہے۔ فقط اصل
 زرعی کی واپسی مقصود نظر نہیں ہوتی بلکہ سود بھی۔“

(روزنامہ ”نوائے وقت“ ۲۵ دسمبر ۱۹۸۶ء)

مضمون ایک ہجوم رہبران ہے رہبر کوئی نہیں از پروفیسر محمد منور مرزا)

ممکن ہے۔ یہ بات ہمارے پاکستانی امراء، سیاست دانوں، دولت مند کاروباریوں اور
 صاحب ثروت حضرات کے لئے انجمن کی حیثیت رکھتی ہو یا ان کے لئے انتہائی لمحہ فکریہ کا باعث
 ہو۔ کہ حضرت قائد اعظمؒ کے ضمن میں بھارت کے مشہور انگریزی روزنامہ نے لکھا ہے۔ (۲۰
 اکتوبر ۱۹۳۸ء کو حضرت قائد اعظمؒ کی ایک وصیت کی خبر شائع کی تھی) اور وہ یوں تھی کہ
 ”مسٹر جناح نے اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں چالیس لاکھ روپے چھوڑے ہیں۔ جن سے
 پاکستان اور انڈیا میں تعلیمی ادارے فائدہ اٹھائیں گے۔ پبلک فنڈ میں انہوں نے چوراسی لاکھ روپے
 چھوڑے ہیں جو مسلم لیگ اور چند دیگر اداروں کو منتقل ہو جائیں گے۔ ذاتی فنڈ سے بمبئی یونیورسٹی کو
 جہاں مسٹر جناح نے کچھ عرصہ تعلیم حاصل کی پچاس ہزار روپے، انجمن اسلام بمبئی اور اینگلو عربک
 کالج دہلی کے لئے پچیس پچیس ہزار روپے اور اپنے خاندان کے افراد کے لئے کچھ حصہ ادا کرنے کے
 بعد باقی بیس لاکھ روپے کی رقم مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامیہ کالج پشاور اور اسلامیہ سندھ مدرسہ
 کراچی (جہاں قائد اعظمؒ نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی) کے مابین برابر برابر تقسیم کر دی
 جائے گی“

(روزنامہ ”سٹیسٹین“ ۲ اکتوبر ۱۹۳۸ء)

اثر سہیلی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔

نہ منصب کا لالچ، نہ سازش کا ڈر ہو
فقط تیری رحمت پہ جن کی نظر ہو
الہی! ہمیں ایسے انسان عطا کر!
نہ تن کی محبت، نہ دھن کی محبت
دلوں میں فقط ہو وطن کی محبت
الہی! ہمیں ایسے انسان عطا کر!

امبیڈکر کی کتاب ہے جس کا نام ہے (What Congress and Gandhi did to

Untouchables By Dr Ambedkar

یہ کتاب اچھوتوں کے باب میں ایک سنسنی خیز اور عبرتناک مطالعہ ہے۔ ”اچھوتوں نے جب اپنے سیاسی حقوق کا مطالبہ کیا تو گاندھی جی نے بھی جات پات توڑ کر منزل قائم کرنا شروع کر دیئے، حالانکہ اچھوتوں کو محض دھوکہ دینا مقصود تھا۔ بہر حال دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر ڈاکٹر امبیڈکر نے اچھوتوں کو ”ہندو جاتی“ سے الگ قوم تسلیم کئے جانے کا مطالبہ کیا۔ قائد اعظمؒ، علامہ اقبالؒ اور دوسرے مسلمان مندوبین نے بھرپور تعاون کیا۔ ان مظلوموں کے ساتھ ہر انصاف پسند شخص کو ہمدردی تھی۔ مسلمان امداد کرنا اپنا دینی فریضہ جانتے تھے، گاندھی جی نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ اچھوتوں کو ان کا حق نہ ملے، لیکن برطانوی حکومت نے گاندھی جی کے سارے دلائل رد کر کے اچھوتوں کو جداگانہ حق رائے دہی دے دیا تھا، بس پھر کیا تھا سارے ہمدت میں طوفان آگیا، ہر لالہ کائیں کائیں کرنے لگا۔ گاندھی جی نے مرن برت رکھ لیا۔ کیا وہ مرن برت اچھوتوں کے مفاد میں تھا؟ ڈاکٹر امبیڈکر کے بقول یہ مرن برت ہندو جاتی کی بہتری کی خاطر تھا۔“

(روزنامہ ”نوائے وقت“، ۲۶ جنوری ۱۹۹۰ء لاہور)

”ہندو جاتی کا اچھوتوں کے ساتھ سلوک“ — تحریر: پروفیسر محمد منور مرزا)

حضرت قائد اعظمؒ نے کانگریس کے ہتھکنڈوں کے بارے میں لکھنؤ کے مسلم لیگ کے اجلاس میں فرمایا۔ ”کانگریس نے اس بات کا بالوضاحت ثبوت پیش کر دیا ہے کہ کانگریس کے ذریعے صرف ہندو ہی ہندوستان کے واحد مالک ہوں گے، کانگریس کی یہ پالیسی مسلمان اور ہندو میں فسادات کا پیشہ خیمہ ہوگی اور شمشادہیت کے ہاتھ زیادہ مضبوط ہوں گے، میں خود بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہندوستانیوں میں بہت سے اختلافات رونما ہو چکے ہیں، جنہوں نے اشتراک عمل اور تعاون

کے جذبات کو ناممکن بنا کر رکھ دیا ہے۔ ”حضرت قائد اعظم“ نے ایک موقع پر مسلم لیگ کے مقاصد اور نظریات کی ترجمانی کرتے ہوئے فرمایا تھا، کہ ”مسلم لیگ برطانوی حکومت یا کسی سیاسی جماعت یا مجلس قانون ساز، اس بات کی اجازت نہیں دے گی کہ کوئی بھی گروپ مسلمانوں کے حقوق کو پامال کرے۔ کانگریس اگر یہ دعویٰ کرتی ہے۔ کہ اس نے مسلمانوں کے لئے بہت کچھ کیا ہے تو واقعی یہ بتائے کہ اس نے اب تک مسلمانوں کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ بتائیے کہ اس نے مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کے حقوق و مراعات کی نگرانی اور تحفظ کے سلسلے میں کیا تیر مارا ہے۔ کانگریس کے نزدیک مسلمان رابطہ عوام کی تحریک کے مقاصد کیا ہیں؟ کیا یہ تمام مسلمانوں کا شیرازہ بکھیرنے اور انہیں کمزور کرنے کے ارادے نہیں ہیں؟ یہ سبھی جھٹکنڈے انہیں اپنے قائدین سے بدظن کرنے کے لئے نہیں۔ بہر حال کانگریس ہر محاذ پر ناکام رہی ہے۔ اور اب بہتر یہی ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ بہتر اور جائز سلوک کیا جائے۔“

محمد اشرف خان تحریر کرتے ہیں۔ ”ہندو کانگریس کے عزائم اور ارادوں کو بے نقاب کرنے اور ہندوؤں کی جنگ جو یہاں چالوں کا مقابلہ کرنے کے لئے قائد اعظم محمد علی جناح نے ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کا ایک ہنگامی اجلاس لکھنؤ میں طلب کیا۔ جس میں پنجاب کی طرف سے سر سکندر حیات خاں، نواب احمد یار خان، دو لٹانہ، نواب محمد شاہ نواز خاں آف ممدوٹ اور پنجاب کونسل کے مسلم ارکان، ملک برکت علی، میاں غلام رسول بارایت لاء، پیر تاج الدین بارایت لاء، سید خلیل الرحمن، شیخ محبوب احمد اور مولانا ظفر علی خان نے شرکت کی۔ اس اجلاس میں قائد اعظم محمد علی جناح نے تمام صوبوں کے مسلمان مندوبین سے اپیل کی۔ کہ وہ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔ تاکہ کانگریس کے عزائم کا مقابلہ اور مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جاسکے۔ اجلاس لکھنؤ کے بعد مسلم لیگ میں نئی جان آگئی وہ لوگ جو مسلم کانفرنس کا لبادہ اوڑھ کر مسلم لیگ سے الگ ہو گئے تھے وہ سب کے سب مسلم لیگ میں واپس آ گئے۔ اور مسلم لیگ نے ایک فعال سیاسی جماعت کی حیثیت سے ملک میں مسلمانوں کے سیاسی وقار کے لئے جدوجہد کا آغاز کر دیا۔ مسلمانوں نے مسلم لیگ کے سبز ہلالی پرچم کے نیچے جمع ہو کر ”تحت یا تختہ“ کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان نے ہندو کانگریس اور برطانوی سامراج دونوں کی آنکھیں کھول دیں کہ مقابلہ ایک زندہ اور غیور قوم سے ہے۔ جن کی عنان قیادت خداوند قدوس نے ایک ہوشیار، بالغ نظر اور باعزم سیاست دان کو سونپ رکھی ہے اور یہ وہ سیاست دان ہے کہ جس کے ایمان و یقین کو نہ نہرو کی دھمکیاں متزلزل کر سکتی ہیں۔ نہ گاندھی کی فریب کارانہ چالیں شکست دے سکتی ہیں اور نہ سپرو کی قانونی مویشگافیاں ڈگمگا سکتی ہیں۔ قائد اعظم محمد علی جناح نے خدا کے بھروسے اور مسلمانوں کی تنظیم کے

بل بوتے پر تنہا کانگریس اور برطانوی سامراج کے باہمی گٹھ جوڑ کو شکست دی۔ اور ان کی فریب کارانہ چالوں اور سیاسی دسیسہ کارپوں کا مسکت اور دندان شکن جواب دیا، اسے نہ گاندھی کی ”اندرونی آواز“ برہمائی اور نہ ٹیل کی خانہ جنگی کی احمقانہ دھمکیاں متزلزل اور ہراساں کر سکیں۔ اس نے قوم کو ایک نیا نظریہ دیا۔ اور وہ نظریہ تھا خود اعتمادی کا۔

اس نے کہا ”دنیا کی کوئی طاقت یا جماعت یا قوم اس وقت تک زندہ نہیں رہ سکتی، جب تک اس کی پشت پر طاقت نہ ہو، وہ قومیں مٹ جایا کرتی ہیں جو اپنے بازوؤں کے بجائے غیروں کے ہاتھ پر جینے کی کوشش کرتی ہیں“ —

(علامہ لاناظفر علی خان، مصنفہ محمد اشرف خان عطا، صفحہ نمبر ۱۶۳ - ۱۶۲)

چنانچہ حضرت قائد اعظمؒ نے پنجاب مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کی سالانہ کانفرنس ۱۸ مارچ ۱۹۴۴ء میں خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ ”پاکستان کا مطالبہ اب کروڑوں مسلمانوں کے نزدیک ایمان کا حصہ بن چکا ہے، یہ اب ایک نعرہ ہی نہیں، مسلمانان ہند نے اس حقیقت کو اچھی طرح پہچان لیا ہے کہ ان کی حفاظت، نجات اور مقدر کا واحد ذریعہ پاکستان ہے۔ وہ پاکستان جو جبر و پذیر ہو گا تو ساری دنیا میں یہ آواز گونجے گی کہ ایک ایسی مسلم سٹیٹ معرض وجود میں آئی ہے جو اسلام کے درخشندہ عظمت و وقار کا احیاء کرے گی“

(تقریر جناح - جلد دوم - صفحہ نمبر ۸۵)

جناب پروفیسر کرم حیدری اپنی کتاب ”ملت کا پاسبان“ میں حضرت قائد اعظمؒ کو نہایت خوب صورت خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں۔

”دین اسلام کے ساتھ بے پناہ شغف اور گہری وابستگی کا ہی ثمرہ تھا کہ قائد اعظمؒ کو ایک نہایت مخلص مسلمان کی زندگی نصیب ہوئی۔ انہوں نے تمام عمر قلم کے سوا کوئی ہتھیار نہ اٹھایا لیکن انہوں نے مسلمانوں کی قومی آزادی کے لئے اتنی زبردست جدوجہد کی کہ تاریخ انہیں ملت اسلامیہ کے عظیم ترین مجاہدین کی صف میں جگہ دے رہی ہے۔“

وہ تمام عمر برطانوی انداز کی قائم کی جانے والی عدالتوں میں قانونی جنگیں لڑتے رہے لیکن جہٹ اور فریب کی اس دنیا میں رہ کر کام کرنے کے باوجود انہوں نے جھوٹ اور فریب دونوں سے اپنے دامن کو پاک رکھا اور اس طرح اپنے پیارے نبیؐ کے نقش قدم پر چل کر اپنے لئے ”صادق“ کا اعزاز حاصل کیا۔ قوم نے انہیں مسلم لیگ کی تقویت کے لئے لاکھوں روپے کے چہرے دیئے۔ لیکن انہوں نے کہیں ایک پیسہ ناجائز نہ خرچ کیا نہ ہونے دیا اس طرح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں امین بھی ہوئے۔ اس مجاہدانہ امانت اور دیانت میں بے مثال زندگی

سہ کرنے کے بعد لحد میں آسودہ خواب ہوئے تو بیت اللہ شریف اور مسجد نبوی اور روضہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ان کا مزار دنیا بھر کے چند ایسے مزارات میں سے ہے جس پر رات دن قرآن خوانی اور دعائے مغفرت ہوتی رہتی ہے۔ جو بجائے خود اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کے علو مرتبت کی ایک نہایت روشن دلیل ہے۔“

(ملت کا پاسبان - مصنفہ پروفیسر کرم حیدری

صفحہ نمبر ۳۳۳-۳۳۵)

حضرت قائد اعظمؒ کے بارے میں جناب قتیل شفائی کی یہ نظم بہت بھلی لگتی ہے۔

ہمارے سر پر کسی سا بن جیسا تھا
زمین پہ رہ کے بھی وہ آسمان جیسا تھا
وہ ہر ڈگر پر سدا مرکز نگاہ بنا!
وجود اس کا ہمیشہ چراغ رہ نما!
وہ منزلوں کے چمکتے نشان جیسا تھا
زمین پہ رہ کے بھی وہ آسمان جیسا تھا
ہمارا رہبر کامل، ہمارا وہ محسن
بہت بڑا تھا، بہت ہی بڑا تھا وہ لیکن
سلوک اس کا کسی مریبان جیسا تھا!
زمین پہ رہ کے بھی وہ آسمان جیسا تھا

پیام صبح کا سب کو سنا دیا اس نے
تمام سوئے ہوؤں کو جگا دیا اس نے
تکلم اس کا سحر کی اذان جیسا تھا
زمین پہ رہ کے بھی وہ آسمان جیسا تھا
کبھی قتیل سر اس کا جھکا سکا نہ کوئی
کہ اس کو اپنی جگہ سے ہلا سکا نہ کوئی
وہ اپنی ذات میں گویا چٹان جیسا تھا
زمین پہ رہ کے بھی وہ آسمان جیسا تھا

حن دنوں کانگریس کی طرف سے مسلم لیگ اور حضرت قائد اعظمؒ پر یہ الزامات عائد کئے جا رہے تھے کہ مسلم لیگ ہندوستان کی آزادی کے خلاف ہے اور وہ آزادی کا راستہ روک رہی

ہے۔ قائد اعظمؒ نے ایک بیان میں اس کا جواب دیا جو انگلستان کے مشہور اخبار مانچسٹر گارڈین میں شائع ہوا۔

”مسلمانوں کو نیابی حکومت سے بھی ہمیشہ خوف اور خطرات رہے اور اس سے بھی زیادہ جوہوریت سے جب وہ ہندوستان میں پوری پوری برقی جائے۔ جس وقت سے ۱۹۰۸ء میں منٹو نے سکیم نافذ ہوئی اور ۱۹۱۶ء کا تاریخی ہندو مسلم معاہدہ ہوا، مسلمانوں کا جداگانہ طریقہ انتخاب اور آئینی تحفظات پر اصرار، ان کے اس خوف کی علامت اور دلیل ہے۔ لیکن جس وقت سے نئے صوبائی آئین کا افتتاح ہوا یہ بات اس طرح ثابت ہو گئی کہ اس میں کوئی شک نہیں رہا۔ کہ ہندوستان میں جمہوری پارلیمنٹری گورنمنٹ کا عمل درآمد ناممکن ہے۔ وہ قطعی ایسی فرقہ وارانہ (مذہبی) مستقبل اکثریت پر متبجح ہوا جو اقلیتوں پر حکمران تھی اور اپنے اختیارات فرائض اور حکومت کے نظام کو اس مقصد کے لئے برت رہی تھی۔ کہ اقلیتوں پر فرقہ وارانہ (مذہبی) اکثریت کی بالادستی تسلط اور حکومت قائم ہو جائے۔

اس لئے میرا اندازہ یہ ہے کہ جمہوریت کے معنی صرف یہ ہوں گے کہ پورے ہندوستان پر ہندو راج قائم ہو جائے۔ یہ وہ حالت ہے جسے مسلمان ہرگز قبول نہیں کریں گے۔ اس لئے نہایت احتیاط کے ساتھ غور کرنے کے بعد مسلم لیگ اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ ہندوستان کے آئین کے پورے مسئلے پر از سر نو غور کیا جائے۔“

Speeches and Writings of Mr Jinnah P-98,99

Compiled By Jameel-ud-Din Ahmad

مسٹر گاندھی نے ہریجن میں لکھا۔

جناب جناح صاحب برطانیہ سے متوقع ہیں کہ وہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کرے جو کچھ کانگریس کر سکتی ہے یادے سکتی ہے اس سے ان کا اطمینان نہیں ہو گا کیونکہ وہ ہمیشہ اور اپنے نقطہ نظر سے اور زیادہ کی خواہش کر سکتے ہیں اور اس سے بھی زیادہ کی جو برطانوی دے سکتے ہیں۔“

اس کے جواب میں قائد اعظمؒ نے کہا۔

”یہ حقیقت ہے بہت دور دور اور ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے نہایت توہین آمیز ہے۔ مسٹر گاندھی کے مرتبے کے آدمی کو اس جرم کا مرتکب نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ہم نے عزم کیا ہے۔ کہ اپنے ان حقوق کے لئے جو ہمیں جائز طور پر پہنچتے ہیں۔ لڑیں گے اور آخر دم تک لڑیں گے۔ برطانیہ کے علی الرغم اور کانگریس کے علی الرغم میں مسٹر گاندھی کو یقین دلاتا ہوں کہ مسلمانوں کو

صرف اپنی ہی طاقت پر بھروسہ ہے۔ ہم اور کسی پر بھروسہ نہیں کرتے۔“

(Speeches and writings of Mr. Jinnah Compiled by Jame
el-ud-din Ahmad)

قائد اعظمؒ کا اہم بیان

کانگریس کی طرف سے کانٹنیٹیوٹیٹ اسمبلی کے لئے بڑا شدید تقاضا تھا اور مسٹر گاندھی بڑے جوش سے اس کے لئے پروپیگنڈا کر رہے تھے۔ انہوں نے نیوز کرائیکل (لندن) کے نمائندے کو بیان دیا کہ برطانوی عوام ان کے خیالات سے متاثر ہوں۔ اس کا جواب قائد اعظمؒ نے بھی نیوز کرائیکل ہی کی وساطت سے دیا۔ انہوں نے فرمایا۔ ”میں اسی کو ترجیح دیتا کہ چپ رہوں۔ مگر میں اس کے لئے مجبور ہو گیا ہوں کہ کانگریس کے اس ایک طرفہ پروپیگنڈے کی تردید کروں جو ہندوستان اور غیر ممالک میں ہو رہا ہے۔ واقع یہ ہے کہ میں صرف مسلم لیگ کے خلاف حملوں کی مدافعت کے لئے بولتا ہوں۔“

بہت دن نہیں ہوئے کہ مسٹر گاندھی نے ایک امریکی اخبار نویس کو گفتگو کا موقع دیا اس نے جب مسٹر گاندھی سے یہ سوال کیا کہ جمہوری ہندوستان میں پارٹیوں کے متعلق ان کی کیا رائے ہے تو مسٹر گاندھی نے جواب دیا۔ ”ہندوستان میں بس ایک پارٹی ہے جو کچھ کر سکتی ہے اور وہ کانگریس ہے“ نامہ نگار نے کہا ”مسلم لیگ بھی تو ہے“۔

مسٹر گاندھی بولے ”میں سوائے کانگریس کے اور کسی پارٹی کو منظور نہیں کر سکتا۔“ اس پر اخبار نویس نے کہا ”اگر ہندوستان میں صرف ایک ہی پارٹی ہے تو گورنمنٹ فاشٹ ہوگی جو جمہوری نہیں ہو سکتی۔ مسٹر گاندھی نے جواب دیا۔ آپ اس کو جس نام سے چاہے برا کئے مگر ہندوستان میں صرف ایک ہی پارٹی ہو سکتی ہے اور وہ کانگریس ہے۔“

• مسٹر گاندھی جو کانٹنیٹیوٹیٹ اسمبلی کے معاملے میں مذہب اور مشتبہ تھے یکایک اس کے مرید، اس کے پر جوش مبلغ بن گئے ہیں۔ وہ مسلم لیگ کے لئے غلط بیان کر رہے ہیں اور اس کی نیت پر حملے، مثال کے طور پر یہ کہ انہوں نے ”ہریجن“ میں لکھا۔ مسلم لیگ ملک کی ترقی میں سدرہ ہے اور جو اونچی بولی بولے اس کے ہاتھ بکنے کے لئے تیار ہے۔“

لیکن نیوز کرائیکل میں ان کے بیان کی غرض یہ ہے کہ برطانوی عوام اسے پڑھیں، شر سے اتالیبرز بیان ہونا مشکل ہے اور وہ بھی مسٹر گاندھی کا، افسوس ہے کہ مسٹر گاندھی کا بیان جو حق کے بڑے داعی ہیں، کانٹنیٹیوٹیٹ اسمبلی کے ساتھ ان کی یہ محبت ہی بس اس کی برابری کر سکتی ہے

جتنی ان کو اس مقصد سے ہے۔ یعنی ہندو مسلم اتحاد سے، جس کے واسطے وہ بیس برس سے جدوجہد کر رہے ہیں۔

اب وہ کہتے ہیں۔ جو رائے قابل شمار ہے وہ ہندوستانی رائے ہے۔ کانگریس کی رائے بھی نہیں۔ ہندوستان کی رائے اس کے آدمیوں کی آزاد رائے (ووٹ) سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ ان کی مرضی کی تصدیق کا واحد، سچا اور جمہوری طریقہ یہ ہے کہ ہر بالغ کے ووٹ یا اس کے کسی متفقہ مساوی بدل سے کیا جائے۔

پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بالغ ووٹ کے مساوی نعم البدل کے متعلق باہمی رضامندی کس کے درمیان ہوگی دوسرا یہ کہ اگر برطانیہ مسلمانوں، ہندوؤں یا کسی اور کی رائے پر اتحاد نہ کرے حتیٰ کہ کانگریس کی رائے پر بھی نہیں تو پھر ہندوستان کی رائے کیا ہے؟

لیکن یہ بات ہے کہ جو کانگریس کی یہ حقیقت کھل گئی ہے کہ وہ ہندوستان کی نمائندگی نہیں کرتی بلکہ حقیقت میں ہندو انجمن ہے تو مسٹر گاندھی کو یہ خیال آیا ہے کہ وہ کانسیٹیوٹ اسبلی کی حمایت کریں۔ جو ہندوستان کے حالات میں کانگریس کا دوسرا اور ضمیمہ ترنسہ ہوگی۔

والیان ملک کو ایک طرف ہٹا کر وہ فرماتے ہیں۔ برطانیہ کا ارادہ مسلمان، ہندو یا کسی اور رائے پر کیوں منحصر ہو۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔

قائد اعظمؒ نے کانسیٹیوٹ اسبلی کے تمام پہلوؤں پر مدلل بحث کرنے کے بعد بالآخر فرمایا۔

جو کانسیٹیوٹ اسبلی مسٹر گاندھی تجویز کر رہے ہیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ ایک ایسی مجتمع جمعیت ہوگی جس کی تقدیر اور جس کا انتظام کانگریس ٹولی کے ہاتھ میں ہو گا۔ وہ عوامی مرضی نہیں جو مسٹر گاندھی فرما رہے ہیں بلکہ وہ اس ایک فرقے کی رائے ہوگی جس کی عظیم اکثریت ہے۔ کیوں! اس لئے کہ مسٹر گاندھی کی تجویز یہ تھی کہ اس میں تناسب آبادی کے مطابق نیابت ہو۔“

(پاکستان ناگزیر تھا۔ مصنفہ سید حسن ریاض صفحہ نمبر ۲۲۵-۲۲۸)

جناب سید حسن ریاض اپنی کتاب میں مزید تحریر کرتے ہیں۔ جب وائسرائے کی مسٹر گاندھی سے ملاقات ہوئی سب سے پہلے تو انہوں نے وائسرائے سے یہ کہا کہ ”میں اپنے ساتھیوں کی رائے کے خلاف آپ سے ملنے کے لئے آیا ہوں گویا کانگریس کی طرف سے نیابت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا“ ”مگر یہ بتانے کے لئے آیا ہوں کہ اگر برطانوی وزارت کی ہدایت کے تحت وائسرائے موجودہ برطانوی رائے کے مطابق عمل کر سکیں تو ہر ایک کے لئے باعث عزت تصفیے کا

موقع ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے مجھ کو گفت و شنید کے لئے کوئی اجازت نامہ نہیں دیا ہے۔ میں ذاتی طور پر نہ تصفیے کے لئے مضطر ہوں اور نہ اس کے نہ ہونے کے لئے۔ اگر قتل عام ہونے ہی والا ہے، تو میں عدم تشدد کا حامی ہونے کے باوجود اسے بلا جھجک دیکھوں گا۔ میرے مؤید مجھ سے یہ درخواست کر رہے ہیں کہ اعلان جنگ کر دوں۔ مگر میں نے انکار کر دیا ہے۔ تاوقتیکہ عدم تشدد کے لئے وہ اپنا دل اور اپنی کامل اطاعت میرے حوالے نہ کر دیں۔“

کیسی عجیب گفتگو تھی، دھمکیاں ہی دھمکیاں اور فریب ہی فریب۔ یہ انگریز ہی کا تحمل تھا جو اسے گوارا کرتا تھا۔ وائسرائے نے اس کے جواب میں کہا۔ ”یہ ضروری ہے کہ مسٹر گاندھی اس حیثیت میں ہوں کہ کانگریس کی طرف سے بول سکیں اور کانگریس کو پابند کریں۔ اگر واقعی کوئی ترقی منظور ہو تو یہ اشد ضروری ہے کہ مسٹر گاندھی اپنے رفقا کو ساتھ لے کر کانگریس کی سرگرمیوں کی رہنمائی کریں اور اس پر قابو رکھیں۔“

(Transfer of power in India by: V.P. Menon. P74-76)

(ماخوذ از۔ پاکستان ناگزیر تھا۔ مصنف: سید حسن ریاض، صفحہ ۲۳۶)

مہاتما گاندھی کی مہتمائیت کے مناظر و مظاہر برصغیر کی سیاسی تاریخ میں اسی طرح بکھرے پڑے ہیں۔ ان کی روایتی مہتمائیت جو روایتی ہندو ازم کی ایک بہت بڑی مثال ہے۔ ان کی شخصیت میں جگہ جگہ نظر آتی ہے ہندو دھرم کا نمائندہ قائد ہونے کی وجہ سے انہوں نے ہندو دھرم کی مکمل پاسداری میں کبھی جھول نہ کھایا۔ انہوں نے سوچا کچھ کیا کچھ، دیکھا کچھ بتایا کچھ، وعدہ کچھ کیا۔ عمل برعکس کیا۔ جلوت میں بیان کچھ اور دیا اور خلوت میں کچھ اور۔ یہ کمال حوصلہ، تدبیر، ہوشمندی، مصلحت کوشی اور معاملہ فہمی حضرت قائد اعظمؒ کی تھی کہ انہوں نے گاندھی جیسے شش جہتی شخصیت کے مالک انسان سے گزرا کیا اور پھر انگریزی تعصب و عناد کا اگلے محاذ پر مقابلہ کیا۔ میں یہ بات کہنے میں باک محسوس نہیں کرتا کہ برصغیر میں سوائے قائد اعظمؒ کے اور کوئی ایسی شخصیت نہیں تھی جو مہتما جی کو ٹھیک ٹھیک ٹھکانے پر لگاتی

مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب India Wins Freedom جس کا ترجمہ (آزادی ہند کے نام سے تلخیص، تبویب، استدراک کے ساتھ جناب رئیس احمد جعفری نے کیا ہے۔ یہ بڑی اہم کتاب ہے۔ جس میں تحریک پاکستان اور خصوصاً گاندھی کے بارے میں بڑی بڑی معلومات میسر آتی ہیں، مولانا آزاد تحریر فرماتے ہیں۔

”کانگریس کی تاریخ میں یہ بہت نازک وقت تھا۔ ہندوستان سے باہر کی دنیا میں لرزہ خیز واقعات رونما ہو رہے تھے۔ ہم سب ان سے متاثر تھے لیکن سب سے زیادہ پریشان کن چیز خود

ہمارے اندرونی اختلافات تھے۔ میں کانگریس کا صدر تھا، میں چاہتا تھا کہ ہندوستان جمہوری ممالک کے کیمپ میں داخل ہو جائے بشرطیکہ اسے آزاد کر دیا جائے۔

گاندھی جی کا ارادہ خود کشی

گاندھی جی اب تک اپنی رائے پر قائم تھے، یعنی ہندوستان کو کسی حالت میں بھی شریک جنگ نہ ہونا چاہئے وائسرائے سے ملاقات کے دوران میں بھی انہوں نے یہی بات کہی۔ یہ وہ وقت تھا کہ فرانس گھنے ٹیک چکا تھا اور جرمن طاقت اپنے عروج پر تھی۔

گاندھی جی کے لئے یہ نہایت نازک وقت تھا۔ متعدد مواقع پر انہوں نے خود کشی تک کا ارادہ ظاہر کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اگر وہ جنگ کی لائی ہوئی معیبت روک نہیں سکتے۔ تو کم از کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ اپنی زندگی کا خاتمہ کر کے اس ہولناک منظر کے تماشائی نہ بنیں، انہوں نے متعدد بار مجھ پر زور دیا کہ میں ان خیالات کی پشت پناہی کروں لیکن میں ان سے متفق نہ ہو سکا۔

میرے نزدیک عدم تشدد کی حیثیت پالیسی کی تھی۔ عقیدہ کی نہیں میرا خیال تھا کہ اگر کوئی چارہ کار باقی نہ رہ جائے تو ہندوستانیوں کو تلوار سنبھالنے کا حق ہے۔ البتہ آزادی ہند کی جدوجہد پر امن طریق پر ہونی چاہئے۔

کانگریس ورکنگ کمیٹی اس مسئلے پر دو گروہوں میں بٹ گئی۔ پہلے مرحلے میں جواہر لال نہرو، سردار پٹیل، راجگو پال اچاریہ اور خان عبدالغفار خان میرے ساتھ تھے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد، اچاریہ، کرپلانی، شکر راؤ دیو دل و جان سے گاندھی جی کے حامی تھے۔ یہ لوگ گاندھی جی کے اس خیال سے متفق تھے کہ اگر ایک مرتبہ یہ بات تسلیم کر لی گئی کہ آزاد ہندوستان جنگ میں عملی حصہ لے گا تو آزادی ہند کے لئے ہندوستان کے عقیدہ عدم تشدد کی بنیاد منہدم ہو جائے گی۔ لیکن کانگریس اس کے برعکس میرا خیال یہ تھا کہ اندرونی جدوجہد آزادی کے درمیان اور بیرونی طور پر جارحیت کا مقابلہ کرنے میں فرق ہے۔ آزادی کی جدوجہد الگ چیز ہے اور آزادی کے بعد جنگ میں حصہ لینا دوسری چیز ان دونوں کو گڈلڈ نہیں کرنا چاہئے۔

کانگریس کا فیصلہ

جولائی ۱۹۴۱ء میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کے جلسے پونا میں ہوئے، جہاں میرا نقطہ نظر تسلیم کر لیا گیا۔ دو تجویزیں منظور ہوئیں۔ ۱۔ پہلی تجویز میں کانگریس کے اس عقیدہ کی

تجبد کی گئی کہ آزادی ہند کے لئے عدم تشدد کی پالیسی صحیح اور درست ہے اور اسے برقرار رہنا چاہئے۔

۲۔ دوسری تجویز میں اعلان کیا گیا کہ نازیست اور جمہوریت کی اس جنگ میں ہندوستان کا صحیح مقام جمہوریت کا کیمنپ ہے لیکن مساعی جنگ میں ہندوستان اس وقت تک حصہ نہیں لے سکتا جب تک آزاد نہ ہو جائے دونوں تجویزوں کا مسودہ میرا بنایا ہوا تھا۔

گاندھی جی کا اضطراب خیال

ان تجویز سے گاندھی بہت خوش ہوئے۔ مبارک باد کا ایک تار بھیجے ہوئے انہوں نے مجھے لکھا کہ وہ اس بات سے خوش نہیں کہ آزادی کی جدوجہد میں عدم تشدد کے عقیدے کی میں نے تائید کی ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ موجودہ حالات میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی میری تجویز منظور کر لے گی اگر ہندوستان آزاد کر دیا گیا تو وہ مساعی جنگ میں حصہ لے گا۔ انہوں نے اس امر کا اظہار کیا کہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو اس بات پر آمادہ نہیں کر سکوں گا کہ ملکی جدوجہد آزادی کے لئے وہ عدم تشدد کی پالیسی پر قائم رہے۔

(آزادی ہند۔ مصنفہ مولانا ابوالکلام آزاد)

ترجمہ تلخیص۔ رئیس احمد جعفری صفحہ نمبر ۶۱-۶۳)

اسی کتب میں مولانا ابوالکلام آزاد آگے چل کر مزید تحریر کرتے ہیں۔

”سیاسی زبان میں گفتگو کیجئے تو یہ ”ڈپلومیسی“ ہے۔ صاف بیانی سے کام لیجئے تو یہ منافقت ہے سوال یہ ہے کہ اگر ورکنگ کمیٹی کی تجویز سے اختلاف تھا اور تشدد میں حصہ لینا کسی طرح گوارا نہیں تھا تو ان ممبران ورکنگ کمیٹی کو غیر مشروط طور پر استعفیٰ دے دینا چاہئے تھا لیکن استعفیٰ کو اس وقت تک ملتوی رکھنا جب تک برطانوی حکومت آزادی دینے پر رضامند نہیں ہو جاتی نہایت پست قسم کی سیاست ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہوا کہ اگر برطانوی حکومت آزادی دینے پر کسی صورت سے رضامند نہ ہوئی تو ہم تشدد کا ہتھیار ہیں جو چاہے آزمالے۔ آخر یہ کون سی منطق ہوئی۔

مولانا نے فرمایا ہے جب انگریزوں نے کانگریس کا دست تعاون جھٹک دیا تو گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک کی تیاری شروع کر دی۔ واقعات کی ترجمانی اگر مولانا کے الفاظ کر رہے ہیں تو انگریزوں کی اس حرکت ناشائستہ کا جواب سول نافرمانی میں ہو سکتی تھی۔ لیکن نہیں واقعہ یہ نہیں ہے۔

لارڈ سنٹنگھم وائسرائے ہند نے گاندھی جی اور قائد اعظمؒ سے تعاون کی درخواست کی۔ دونوں نے اپنی اپنی شرائط پیش کیں۔ قائد اعظمؒ صرف اتنا مانگتے تھے جو ان کا حق تھا۔ گاندھی جی اپنا اور قائد اعظمؒ کا اور اقلیتوں کا حصہ بھی اپنی جیب میں ڈال لینا چاہتے تھے۔ بات یوں نہیں بنی، وائسرائے کے لئے گاندھی جی کا اتنا خطرناک ”دست تعاون“ جھٹک دینے کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ تھا۔

گاندھی جی نے سوچا یہ جنگ کا زمانہ ہے۔ انگریز پریشان ہیں اگر سول نافرمانی یعنی عدم تشدد کے ذریعے تشدد کا مظاہرہ کیا جائے تو انگریز مجبور ہو جائیں گے کہ اکثریت کو راضی رکھنے کے لئے اس کا تعاون حاصل کرنے کے لئے اقلیتوں کو ٹھکرا دیں۔ بد قسمتی سے ان کا یہ اندازہ غلط ثابت ہوا اب انہوں نے دباؤ ڈالنا چاہا اور سول نافرمانی شروع کر دی سول نافرمانی کی تحریک جتنی انگریزوں کے خلاف تھی اس سے کہیں زیادہ مسلمانوں کے خلاف تھی۔

گاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی ناکام ہوئی۔ وہ بھی جیل سے باہر آ گئے اور دوسرے رہنمایان کانگریس بھی۔

یہ حضرات تو یہ سوچ رہے تھے کہ ”ہمارا کوئی قدم آگے نہ اٹھ سکا“ لیکن اس حقیقت پر غور نہ کر سکے کہ کیوں نہ اٹھ سکا، یہ انگریزوں سے سب کچھ چھین سکتے تھے بشرطیکہ دوسروں سے بھی سب کچھ چھین لینے پر آمادہ نہ ہو جاتے۔ انگریز بھی ہوشیار ہو گئے اور دوسرے بھی چوکنے ہو گئے اور انہیں یہ اعتراف کرنا پڑا کہ ”ہم حالات کا شکار بنے ہوئے تھے اپنی قسمت کے مالک نہیں“۔

(آزادی ہند - مصنفہ مولانا ابوالکلام آزاد)

(ترجمہ، تلخیص، استدراک، رئیس احمد جعفری، صفحہ نمبر ۶۸-۶۹)

مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی کی داستان قتل کے بارے میں لکھتے ہیں۔ ”پردہ گرتا ہے۔“

چند آنسو

گاندھی جی کا حادثہ قتل ایک دور کا اختتام ہے۔ آج بھی میں اسے فراموش نہیں کر سکتا کہ کتنے افسوس ناک طریقہ پر نئے ہندوستان کی سب سے بڑی شخصیت کی جان بچانے میں ہم ناکام رہے۔ حادثہ بم کے بعد قدرتا یہ توقع تھی کہ دہلی کی پولیس اور سی آئی ڈی ان کی حفاظت میں کچھ نہ کر سکی۔ بلکہ اگر کسی کو دھمکی کے خطوط وصول ہوں تو بھی پولیس ہوشیار ہو جاتی ہے۔

گاندھی جی کے پاس نہ صرف خطوط اور پمفلٹ آئے۔ نہ صرف انہیں علانیہ قتل کرنے کی دھمکیاں دی گئیں بلکہ ایک بم بھی پھینکا گیا۔ یہ ہندوستان کی سب سے بڑی شخصیت کی موت و زندگی کا سوال تھا۔ لیکن موثر قدم نہیں اٹھایا گیا۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ اس طرح کا احتیاطی اقدام مشکل تھا۔ گاندھی جی کی پرارتھنا کی مجلسیں کھلے میدان میں نہیں بلکہ برلاہاؤس کے لان میں ہوئی تھیں۔ یہ ایسا مقام ہے جسے تمام اطراف سے بلند و بالا دیواریں گھیرے ہوئے ہیں۔ دروازہ کے علاوہ داخلہ کا کوئی راستہ نہیں، پولیس کے لئے بہت آسان تھا کہ وہ آنے جانے والوں کی نگہداشت رکھتی۔

گاندھی جی کا قتل

اس المیہ کے واقع ہونے کے بعد حاضرین کی شہادت سے یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ قاتل مشتبہ طریقہ سے اندر داخل ہوا۔ اس کے حرکات و سکنات اور الفاظ اس طرح کے تھے کہ پولیس اسے زیر نگرانی رکھ سکتی تھی۔ اور پولیس کو ایسا کرنا بھی چاہئے تھا۔ اگر پولیس نے کوئی قدم اٹھایا ہوتا تو وہ بڑی آسانی سے پکڑ کر رہتا کر دیا جاتا بغیر کسی روک ٹوک کے ریوالور لئے ہوئے آیا گاندھی جی جب پرارتھنا کے جلسے میں پہنچے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے گاندھی جی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تمہاری زندگی کا یہ آخری دن ہے، گاندھی نے جواب دیا۔ ہاں! قبل اس کے کہ وہ دوسرا لفظ کہیں تابڑ توڑ تین گولیاں ان کے نحیف و نزار جسم کو چیرتی ہوئی نکل گئیں۔ اس طرح قاتل نے ان کی قیمتی زندگی ختم کر دی۔

پٹیل پر الزام

یہ المیہ جب وقوع پذیر ہوا۔ تو غم و غصے کی لہر کا اٹھنا ایک قدرتی واقعہ تھا۔ کچھ لوگوں نے علانیہ سردار پٹیل کو نااہلیت کا ملزم گردانا۔ جسے پرکاش نرائن نے اس مسئلہ کو اٹھا کر بڑی بہت کا ثبوت دیا۔ گاندھی جی کی موت پر اظہار رنج و غم کے لئے دہلی میں جو جلسہ منعقد ہوا تھا اس میں تقریر کرتے ہوئے جے پرکاش نرائن نے صاف الفاظ میں کہا کہ گورنمنٹ آف انڈیا کا وزیر داخلہ اس قاتلانہ حملہ کی ذمہ داری سے اپنا دامن نہیں بچا سکتا۔ انہوں نے سردار پٹیل سے جواب طلب کیا۔ جب کہ گاندھی جی کے قتل پر علانیہ لوگوں کو آکسایا جا رہا تھا اور اس سے پہلے ان پر باقاعدہ بم پھینکا جا چکا تھا تو پٹیل نے کوئی احتیاطی قدم کیوں نہیں اٹھایا۔

ذمہ داری پٹیل پر

کلکتہ کے مسٹر پرفلا چندر گھوش نے بھی یہ سوال اٹھایا۔ انہوں نے گورنمنٹ آف انڈیا کو بھی ملامت کی کہ وہ گاندھی جی کی جان بچانے میں ناکام رہے۔ انہوں نے کہا کہ سردار پٹیل ایک مضبوط اور کارگزار وزیر داخلہ کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ اس الزام کا ان کے پاس کیا جواب ہے کہ گاندھی جی کی جان بچانے کے لئے انہوں نے کوئی احتیاطی قدم نہ اٹھایا۔

سردار پٹیل کا بیان

سردار پٹیل نے اپنے مخصوص انداز میں یہ الزامات سسے۔ کوئی شبہ نہیں کہ اس حادثہ سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ لیکن اس بات پر فحاشی تھی کہ لوگ انہیں کیوں ملزم گردان رہے ہیں۔ جب کانگریس پارلیمنٹری پارٹی کا اجلاس ہوا تو انہوں نے کہا کہ ان کے خلاف اسی طرح کے الزامات لگا کر کانگریس کے دشمن اس تنظیم میں انفریق پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے گاندھی جی سے اپنی وفاداری کا اعادہ کیا اور کہا پارٹی کو ان الزامات سے متاثر نہیں ہونا چاہئے۔ بلکہ مضبوطی کے ساتھ متحد ہو کر اس صورت حال کا مقابلہ کرنا چاہئے جو گاندھی جی کی موت سے پیدا ہو گئی ہے۔ ان کی اپیل رائیگاں نہیں گئی۔ کانگریس پارٹی کے بہت سے ممبروں نے انہیں یقین دلایا کہ وہ ان کے ساتھ ہیں۔ ”

تقریب قتل پر شیرینی کی تقسیم

مجموعی حیثیت سے سارا ملک گاندھی جی کے قتل سے غمزدہ تھا۔ لیکن بعض شہروں میں گاندھی جی کے حادثہ قتل کی تقریب پر مٹھائی تقسیم ہوئی اور جشن منایا گیا، گوالیار اور اجین میں خاص طور پر۔

گاندھی جی کا قاتل ہیرو بن گیا

گاندھی جی کے قاتل گوڈ سے پر مقدمہ چلایا گیا۔ گوڈ سے کی گرفتاری پر پبلک کارڈ عمل اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہندوستانیوں کے ایک طبقہ پر فرقہ وارانہ زہر کس طرح اثر کر چکا تھا۔ بعض معزز خاندانوں کی خواتین نے اپنے ہاتھ سے سویٹر بن کر گوڈ سے کو بیچے، اس کی رہائی کے لئے ایک تحریک بھی اٹھی۔ اس کے حامی علانیہ طور پر اس کے اقدام کو سراہ نہیں سکتے تھے، لہذا

انہوں نے کہنا شروع کیا کہ گاندھی چونکہ عقیدہ عدم تشدد کے پرستار تھے لہذا ان کے قاتل کو پھانسی نہیں ملنی چاہئے۔ جواہر لال کے پاس اور میرے پاس اس مضمون کے بہت سے تار آئے کہ گوڈ سے کو پھانسی دینا گاندھی جی کے اصولوں کے خلاف ہے۔ قانون بر حال اپنا راستہ چلتا رہا۔ ہائی کورٹ نے اس کی سزایابی کی توثیق کر دی۔ ”

(آزادی ہند — مصنفہ مولانا ابوالکلام آزاد
ترجمہ و تلیخیص رئیس احمد جعفری صفحہ نمبر ۱۷۵-۱۷۷)

گاندھی جی سے چیانگ کی ملاقات

”دہلی میں جنرل لسو کلکتہ گئے، گاندھی برلا پارک میں مقیم تھے، جنرل لسو اور میڈم چیانگ کاشیک ان سے ملنے وہاں آئے۔ یہ ملاقات دو گھنٹہ تک جاری رہی۔ میڈم چیانگ کاؤشیک ترجمان کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ (کیونکہ جنرل لسو چین کے سوا کوئی دوسری زبان نہیں جانتے تھے اور میڈم آسانی سے انگریزی بول لیتی تھیں، گاندھی جی نے انہیں بتایا کہ جنوبی افریقہ میں پہلے پہل کس طرح انہوں نے سبستہ گرہ کا آغاز کیا۔ اور پھر کیونکر تدریجی طور پر عدم تشدد اور عدم تعاون کی تکنیک نے نشوونما کے مراحل ہندوستان کے سیاسی مسائل حل کرنے کے سلسلے میں طے کئے؟

گفتگو کا اچھا اثر نہ ہوا

اس ملاقات کے وقت میں کلکتہ میں موجود نہیں تھا۔ بعد میں جواہر لال نے اس ملاقات کے حالات مجھے بتائے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جواہر لال تمام معاملات میں گاندھی جی کے ہمہنوا نہیں تھے۔ انہوں نے کہا۔ گاندھی جی نے جس انداز میں جنرل لسو سے بات چیت کی، اس کا کچھ اچھا اثر ان پر نہ پڑا۔ میرے لئے اس بارے میں محاکمہ کرنا آسان نہیں ہو سکتا ہے۔ کہ جنرل لسو گاندھی جی کے موقف کے موثرات صحیح طور پر سمجھ نہ سکے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ گاندھی جی کے دلائل کو انہوں نے وزنی نہ محسوس کیا ہو، لیکن مجھے بڑی حیرت ہوگی اگر وہ واقعتاً گاندھی جی کی شخصیت سے متاثر نہ ہوئے ہوں۔ جس کی سحر طرازی سے غیر ملکی پیشہ ہوتے رہے ہیں۔“

مولانا ابوالکلام آزاد آگے چل کر اپنی اسی کتاب میں مزید تحریر کرتے ہیں۔

گاندھی جی نے بہترین موقع کھو دیا

ہمیں یہ معلوم کر کے بہت تعجب اور دکھ ہوا کہ گاندھی نے ہماری تجویز نہیں مانی، انہوں

نے اس امر پر زور دیا کہ تمام سیاسی رہنما خاص طور پر علی برادران سب سے پہلے غیر مشروط طور پر باکر دیئے جائیں۔ انہوں نے کہا کہ گول میز کانفرنس کے مسئلہ پر ہم اسیران سیاسی کی رہائی سے پہلے غور نہیں کر سکتے۔ ہم دونوں مسٹر داس اور میں اس پر متفق تھے کہ یہ غلط تھا۔ جب حکومت اس سے متفق تھی کہ کانگریسی رہنما گول میز کانفرنس سے پہلے رہا کر دیئے جائیں گے۔ پھر خصوصی طور پر اس مسئلہ پر زور دینے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ پنڈت مالویہ ہمارا تبصرہ لے کر پھر گاندھی جی نے پاس پہنچے، لیکن وہ اب بھی اپنی رائے پر قائم رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کانسٹراٹ نے اپنی پیش کش واپس لے لی۔ اس پیش کش کا اصل مقصد یہ تھا کہ کلکتہ میں پرنس آف ویلز کا بائیکاٹ نہ ہو، لیکن چونکہ کوئی مفاہمت نہ ہوئی لہذا بائیکاٹ کی تحریک شاندار طور پر کامیاب ہوئی۔ مگر اس طرح ہم نے سیاسی مفاہمت کا ایک زریں موقع کھو دیا۔

گاندھی جی کی بے تدبیر سیاست

پھر گاندھی نے بمبئی میں سکران نائر کے زیر صدارت ایک کانفرنس طلب کی اس کانفرنس میں گاندھی جی نے بہ نفس نفیس گول میز کانفرنس کی تجویز پیش کی۔ گاندھی جی کے شرائط تقریباً وہ تھے جو اس سے پہلے پنڈت مالویہ ان کے پاس لے کر گئے تھے اس اثنا میں پرنس آف ویلز ہندوستان سے واپس جا چکے تھے اور حکومت کو اس تجویز سے مزید دلچسپی باقی نہ رہ گئی تھی۔ اس بات سے مسٹر داس بہت برہم ہوئے انہوں نے کہا۔ ”گاندھی جی نے بہت بڑی غلطی کی۔“

میں مسٹر داس کے اس فیصلے کو صحیح تسلیم کرنے پر مجبور تھا۔

گاندھی جی کی ایک اور زبردست غلطی

پھر چوراچوری کے حادثہ کے باعث گاندھی جی نے تحریک ترک موالات معطل کر دی۔ اس کا فیصلہ سیاسی حلقوں میں سنگین ترین سیاسی رد عمل کا اور ملک میں بے حوصلگی پیدا کرنے کا سبب ہوا۔ حکومت نے صورت حال سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور گاندھی جی کو گرفتار کر لیا۔ انیس چھ سال کی سزائے قید ہوئی اور تحریک ترک موالات آہستہ آہستہ ختم۔

پتہ پتہ شخصیت

گاندھی جی نے لارڈ سلٹھکو سے کہا۔ برطانوی حکومت کو ہتھیار ڈال کر ہٹلر کا مقابلہ

روحانی قوت سے کرنا چاہئے۔ لارڈ کنٹنگھم کو یہ سن کر ششدر رہ گئے ان کے نزدیک یہ بڑی عجیب اور غیر معمولی تجویز تھی۔ عام طور پر ان کی کار تک پہنچا آتا تھا۔ لیکن اس موقع پر نہ انہوں نے گھنٹی بجائی نہ اسے ڈی سی کو بلایا، نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی ایک گرم سم اور حیران و پریشان و اسرے کے سامنے سے اٹھ کر تنہا اپنی کار تک آئے۔ گاندھی جی جب مجھ سے ملے تو انہوں نے یہ واقعہ بیان کیا اور اس بات پر اظہار حیرت کیا کہ واسرے نے رسم و اخلاق کو بھی فراموش کر دیا۔ میں نے جواب دیا، آپ کی تجویز سے واسرے اتنا بھونچکا ہوا کہ اسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ معمولاً وہ کیا کرتا تھا۔ میری یہ توجیہ سن کر گاندھی جی ٹھٹھا مار کر ہنس پڑے۔

سردار پٹیل کا گاندھی جی پر اثر

گاندھی نے مجھ سے کہا کہ اگر جاپانی فوج نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تو وہ ہمارے دشمن کی حیثیت سے نہیں بلکہ برطانیہ کے دشمن کی حیثیت سے آئے گی اور سردار پٹیل بھی میری رائے رکھتے تھے اور شاید گاندھی جی کو وہی اس راہ پر لائے تھے۔ بہر حال ہمارا باہمی اختلاف واضح ہو چکا تھا۔

گاندھی جی کی گول مول باتیں

میں کہہ چکا ہوں کہ آغاز جنگ کے وقت میری یہ رائے تھی کہ برطانیہ کا منظم طور پر مقابلہ کیا جائے۔ لیکن گاندھی جی نے میری اس رائے سے اتفاق نہیں کیا تھا لیکن اب تو ان کی رائے تبدیل ہو چکی تھی میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ دشمن جب ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھ چکا ہے تو برطانوی حکومت ایک منظم و نافذ تحریک کو کس طرح برداشت کرے گی۔ گاندھی جی کا خیال تھا ضرور کر لے گی۔ جب میں نے ان پر زور دیا کہ وہ اپنے پروگرام کی تفصیل بتائیں تو وہ سوا اس سے کوئی واضح بات نہ کر سکے، سابقہ مواقع کے برعکس اس مرتبہ لوگ رضاکارانہ طور پر گرفتار نہیں ہوں گے۔ وہ گرفتاری کا مقابلہ کر لیں گے اور اس وقت گرفتار ہوں گے جب جسمانی طور پر مجبور کر دیئے جائیں گے۔

بغاوت کا اعلان، صلح کی کوشش

جب ”ہندوستان خالی کر دو“ کارپریڈیشن پاس ہو گیا تو گاندھی جی کے سیکرٹری منادیو

ایسائی نے مس سلیڈ سے کہا کہ وہ جائیں، وائسرائے سے ملیں اور تجویز کا مدعا انہیں سمجھائیں، مس سلیڈ ایک برطانوی امیر البحر کی لڑکی تھیں اور عام طور پر میرابن کے نام سے مشہور تھیں، یہ گاندھی کی بڑی مخلص چیلی تھیں اور کئی برس سے ان کے آشرم میں رہ رہی تھیں۔ مس سلیڈ واردہا سے دہلی پہنچیں اور وائسرائے سے انٹرویو کی درخواست کی۔ وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری نے جواب دیا کہ چونکہ گاندھی جی اعلان کر چکے ہیں کہ وہ بغاوت کے پروگرام پر غور کر رہے ہیں۔ مذاوا وائسرائے ملاقات نہیں کر سکتے۔ سیکرٹری نے یہ بات بھی واضح کر دی کہ جنگ کے زمانہ میں حکومت کسی قسم کی باغیانہ سرگرمی گوارا نہیں کرے گی، خواہ تشدد پر مبنی ہو یا عدم تشدد پر نہ در نمٹ کسی ایسی تنظیم کے نمائندے سے گفتگو کر سکتی ہے جو اس طرح کے خیال رکھتا ہو، اس کے بعد میرابن نے وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری سے ملاقات کی اور دیر تک ان سے باتیں کرتی رہی۔

گاندھی جی کی خود اعتمادی متزلزل ہو گئی

وائسرائے کا میرابن سے ملاقات کرنے سے انکار ایسا واقعہ تھا کہ گاندھی جی محسوس کرنے لگے کہ حکومت آسانی سے ہار ماننے والی نہیں، اس سلسلہ میں گاندھی جی کو جو اعتماد تھا وہ متزلزل ہو گیا۔

گاندھی جی ضرورت کے وقت بھول بھی جایا کرتے تھے

گاندھی جی کرپس سے مشن کے زمانہ میں جب پہلی بار ملے تو کرپس نے یاد دلایا کہ راصل یہ وہی تجاویز ہیں جو کانگریسی رہنماؤں خصوصاً گاندھی جی کے مشورہ سے (کرپس کے دوران قیام واردہا میں) تیار کی گئی تھیں، یعنی جنگ کے دوران میں وائسرائے کی یزیکٹو کونسل کو پورے طور پر ہندوستانی بنادینا اور جنگ کے بعد ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دینا۔

گاندھی جی نے کہا انہیں (واردہا والی تجاویز) کے بارے میں کچھ یاد نہیں (واردہا میں) کرپس سے ملاقات کے دوران میں ان کی جو گفتگو ہوتی تھی، وہ سبزی خوری کے بعض پہلوؤں سے متعلق تھی کرپس نے جواب دیا کہ یہ میری بد قسمتی ہے کہ گاندھی جی غذائی باتیں تو یاد رکھتے ہیں روہ تجاویز فراموش کر دیں جو ان کے رفقاء اور خود ان کے مشورہ سے تیار کی گئی تھیں۔

میرا اور گاندھی جی کا اختلاف

گاندھی جی کا خیال تھا کہ جنگ اب ہندوستان کی سرزمین تک پہنچ چکی ہے۔ لہذا جیسے ہی سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوگی، انگریز کانگریس سے صلح کر لیں گے اور اگر ایسا نہ ہوا تو پھر گاندھی جی کو یقین تھا کہ ایسی حالت میں جب جاپانی فوجیں ہندوستان کے دروازہ پر دستک دے رہی ہیں۔ انگریز کوئی سخت قدم نہیں اٹھائیں گے، لیکن میری رائے یہ نہیں تھی، میرا خیال تھا، جنگ کے اس نازک مرحلہ پر حکومت کسی عوامی تحریک کو برداشت نہیں کرے گی۔ انگریزوں کے لئے زندگی اور موت کا سوال ہے۔ وہ تیزی سے اور سختی سے اپنا کام کر گزریں گے۔

میں اس خیال پر سختی سے قائم تھا کہ موجودہ حالات میں کوئی تحریک جو عدم تشدد پر مبنی ہو نہ ہو کامیاب ہو سکتی ہے، نہ چلائی جاسکتی ہے۔

”مستعفی ہو جاؤ“ گاندھی جی کا مجھ سے مطالبہ

ہماری بحث و گفتگو کا سلسلہ ۵ جولائی کو شروع ہوا، کئی دن تک جاری رہا۔ اس سے پہلے متعدد مواقع پر بعض مسائل سے متعلق میں گاندھی جی سے اختلاف رائے کر چکا تھا۔ لیکن اب ہمارے اختلافات بہت زیادہ نمایاں اور واضح تھے۔ صورتحال نقطہ عروج پر پہنچ گئی، جب گاندھی جی نے مجھے ایک خط بھیجا کہ میرا موقف ان سے اس درجہ مختلف ہے کہ اب ہم ایک ساتھ کام نہیں کر سکتے اگر کانگریس یہ چاہتی ہے کہ گاندھی جی اپنی تحریک چلائیں تو مجھے کانگریس کی صدارت اور ورکنگ کمیٹی کی ممبری سے مستعفی ہو جانا چاہئے۔ اسی طرح جواہر لال کو بھی مستعفی ہو جانا چاہئے۔

پٹیل نے گاندھی جی کو سمجھایا

میں نے فوراً جواہر لال کو بلایا اور گاندھی جی کا خط دکھایا۔ یہ خط پڑھ کر وہ شدید رہ گئے۔ وہ فوراً گاندھی کے پاس پہنچے اور اس اقدام کے خلاف انہوں نے سخت احتجاج کیا۔ پٹیل نے کہا کہ اگر میں کانگریس کی صدارت سے مستعفی ہو گیا اور جواہر لال بھی الگ ہو گئے تو ملک خطرناک حالات سے دوچار ہو گا۔ نہ صرف قوم کے خیالات پر آئندہ ہوں گے بلکہ کانگریس کی بنیاد بھی ہل جائے گی۔

گاندھی جی نے توبہ کر لی

گاندھی جی نے ۷ جولائی کی صبح کو یہ خط میرے پاس بھیجا تھا، دوپہر کے وقت انہوں نے مجھے دیکھا۔ انہوں نے ایک لمبی چوڑی تقریر کی جس کا خلاصہ یہ تھا کہ صبح کو انہوں نے جو خط بھیجا تھا، یہ نئی جلدی میں لکھ دیا تھا۔ بعد میں انہوں نے اس مسئلہ پر غور کیا اور اب وہ اسے واپس لینا چاہتے ہیں۔ میں نے یہ بات مان لی، سہ پہر کو جب درکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا تو گاندھی جی نے جو پہلی بات کہی وہ یہ تھی کہ گناہ گار توبہ کر کے مولانا کے حضور میں پھر حاضر ہے۔

گرفتاری کے بعد گاندھی جی کی اداسی

(گاندھی جی) اور ممبران درکنگ کمیٹی گرفتاری، گرفتار ہو کر بمبئی سے پونا اور احمد نگر لے جائے جا رہے ہیں۔ مسز نائیڈو اپنے کپار ٹمنٹ سے ہمارے پاس آئیں۔ انہوں نے کہا، گاندھی جی ہم سے ملنا چاہتے ہیں۔ ہم ان کے کپار ٹمنٹ میں پہنچے۔ گاندھی جی بہت زیادہ آشفتہ خاطر نظر آ رہے تھے، اتنا اداس اور مضطرب میں نے انہیں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس طرح ایک بیک گرفتار ہو جانا ان کے سان و گمان میں بھی نہیں تھا۔ ان کا خیال تھا کہ حکومت کوئی سخت اقدام نہیں کرے گی۔ ان کا اندازہ غلط ثابت ہوا۔ اب وہ چکر میں تھے کہ کیا کریں۔

گاندھی جی کا دماغی توازن

ایک منٹ کی گفتگو کے بعد گاندھی جی نے کہا جیسے ہی آپ منزل مقصود پر پہنچیں حکومت کو مطلع کیجئے کہ صدر کانگریس کی حیثیت سے آپ اپنا کام جاری رکھیں گے۔ مطالبہ کیجئے کہ آپ کا ریونیوٹ سیکرٹری آپ کے ساتھ رہے اور دوسری ضروری سہولتیں آپ کو بہم پہنچائی جائیں اور اگر ضرورت ہو تو اس مسئلہ کو نقطہ جنگ بنا لیجئے۔

گاندھی جی کا عجیب و غریب بیان

گاندھی جی نے حکومت سے از سر نو گفت و شنید کی طرح ڈالی۔ یہ روش ان کے گزشتہ دور سے مختلف تھی۔ انہوں نے نیوز کرائیکل لندن میں ایک بیان شائع کر دیا کہ اگر ہندوستان کی

آزادی کا اعلان کر دیا جائے تو وہ رضا کارانہ طور پر انگریزوں کا ساتھ دے گا اور مساعی جنگ کی پوری پوری تائید اور پشت پناہی کرے گا۔ یہ بیان پڑھ کر میں بھونچکا رہ گیا۔

گاندھی جی کی قلابازیاں

جب جنگ شروع ہوئی میں نے بڑی کوشش کی تھی کہ کانگریس ایک حقیقت پسندانہ اور مثبت پہلو اختیار کرے۔ گاندھی جی اس وقت اس بات پر اڑے ہوئے تھے کہ گو بلاشبہ ہندوستان کی آزادی کو بہت اہمیت حاصل ہے لیکن عدم تشدد کے عقیدہ پر قائم رہنا آزادی ہند سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ان کی طے شدہ پالیسی یہ تھی کہ اگر ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے تو مساعی جنگ میں وہ انگریزوں سے پورا پورا تعاون کرے گا۔ گاندھی جی کے سابقہ خیالات سے یہ نیا خیال بالکل برعکس تھا۔ اس اظہار خیال نے ہندوستان میں غلط فہمیاں پیدا کر دیں۔ ہندوستانی اس بیان سے الجھن میں مبتلا ہو گئے۔ انگریزوں پر اس نے جو اثر کیا، وہ بھی ناخوشگوار ہی تھا، بہت سے انگریزوں کا خیال تھا کہ جب تک جنگ کا نتیجہ مشکوک رہا، گاندھی جی انگریزوں کی امداد سے کتراتے رہے۔ ان کی موجودہ پیشکش کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ چونکہ اتحادیوں کی فتح یقینی ہے، لہذا وہ مفت میں انگریزوں کی ہمدردی حاصل کر لینا چاہتے ہیں، نتیجہ یہ ہوا کہ گاندھی جی کو اپنی پیشکش سے جو توقع تھی وہ رائیگاں گئی، برٹش گورنمنٹ نے اس پر ذرا بھر بھی توجہ نہ دی۔

”آزادی ہند“ - مصنف۔ مولانا ابوالکلام آزاد

(ترجمہ تلخیص: رئیس احمد جعفری، صفحہ ۳۳۵ - ۳۲۸)

بات دراصل یہیں پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ مولانا آزاد اپنی اسی کتاب میں گاندھی جی کے بارے میں یوں تحریر کرتے ہیں۔

گاندھی جی کس آسانی سے رائے بدل لیتے تھے

۱۹۳۷ء میں مولانا آزاد نے یوپی مسلم لیگ کو کانگریس سے اشتراک و تعاون پر آمادہ کر لیا تھا، لیکن جواہر لال نے وہ پیشکش مسترد کر دی جو مولانا نے مسلم لیگ کے سامنے رکھی تھی۔ ”جب میں نے دیکھا کہ جواہر لال اپنا فیصلہ بدلنے پر آمادہ نہیں ہوتے تو گاندھی جی کی ہدایت حاصل کرنے وار دھا گیا۔ جب میں نے ساری صورت حال گاندھی جی کے سامنے واضح کی، تو انہوں نے میرے ساتھ اتفاق کا اظہار کر لیا اور فرمایا کہ وہ جواہر لال کو مشورہ دیں گے کہ وہ اپنا

فیصلہ بدل لیں، لیکن جواہر لال نے معاملہ کو دوسرے رنگ میں پیش کیا۔ گاندھی جی جواہر لال کے ہم نوا ہو گئے اور اپنے وعدہ کے برخلاف اس معاملہ پر کوئی زور نہیں دیا۔

گوپی ناتھ بارودلانی نے جو آسام کے وزیر اعلیٰ تھے اپنا اختلاف جاری رکھا۔ انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے بنگال کے ساتھ آسام کی گروپ بندی کے خلاف ایک میمورنڈم پیش کیا۔ ہم نے محسوس کیا کہ گروپنگ کا مسئلہ از سر نو اب ہمیں نہیں اٹھانا چاہئے۔

اسی اثناء میں گاندھی جی نے اپنی رائے تبدیل کر دی اور بارودلانی کی حمایت شروع کر دی۔ چونکہ گاندھی جی اب ان کی پشت پر تھے اور ان کی تائید میں بیان پر بیان شائع کر رہے تھے، لہذا انہوں نے ہماری ایک نہ سنی۔“

”آزادی ہند“ مصنف۔ مولانا ابوالکلام آزاد

(ترجمہ و تلخیص: انیس احمد جعفری، صفحہ نمبر ۳۳۹-۳۳۸)

یہی مولانا ابوالکلام آزاد نے جو کچھ مساتما جی کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار درج بالا صفحات میں کیا ہے اسی طرح اسی کتاب میں حضرت قائد اعظمؒ کے ضمن میں بھی تحریر کرتے ہیں۔

گاندھی جی کی بہت بڑی غلطی (۱۹۴۴ء میں جیل سے رہا ہونے کے بعد)

”گاندھی جی نے ایک نئی کوشش مسلم لیگ سے سمجھوتہ کرنے اور مسٹر جناح سے ملاقات کرنے کی کوشش شروع کی۔ میرا خیال ہے اس مرحلہ پر مسٹر جناح تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش گاندھی جی کی بہت بڑی سیاسی غلطی تھی۔ ان کی اس غلطی نے مسٹر جناح کو نمایاں اہمیت دے دی، جس کے بعد میں انہوں نے خوب خوب فائدہ اٹھایا۔

گاندھی جی اور مسٹر جناح

حقیقت یہ ہے شروع ہی سے مسٹر جناح کے سلسلہ میں گاندھی جی کا رویہ کچھ عجیب سا ہو رہا ہے۔ ۱۹۲۰ء میں جب مسٹر جناح کانگریس سے علیحدہ ہوئے تو وہ اپنی سیاسی اہمیت کھوپکے تھے۔ یہ گاندھی جی کی مکاری اور غلط روی تھی جس کے بعد مسٹر جناح نے ہندوستان کی سیاسی زندگی میں از سر نو اہمیت حاصل کر لی۔ حقیقت واقع یہ ہے کہ مسٹر جناح یہ منزل کبھی نہیں حاصل کر سکتے تھے۔ اگر گاندھی جی نے انہیں موقع نہ دیا ہوتا۔ مسلمانوں کا ایک بہت بڑا طبقہ مسٹر جناح کو اور

ان کی پالیسی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا، لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ گاندھی جی مسٹر جناح کے پیچھے پیچھے گھوم رہے ہیں۔ ان سے تعلق کا برتاؤ کر رہے ہیں تو بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں ازسرنو مسٹر جناح کی عظمت پیدا ہو گئی۔ انہوں نے خیال کیا کہ مسٹر جناح ہی موزوں ترین آدمی ہیں جو فرقہ وارانہ تصفیہ حسب دلتواہ شرائط کر سکتے ہیں۔

مسٹر جناح کے دلائل وزنی تھے

”اہم ترین اختلاف گروپ بندی کے سلسلے میں تھا۔ مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ دستور ساز اسمبلی پلان کے ڈھانچے میں تبدیلی کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ گروپ بندی پلان کا ایک اہم حصہ ہے اور اس سلسلہ میں کسی طرح کی تبدیلی سمجھوتے کی خلاف ورزی ہے۔ اس پلان میں خود ہی واضح کر دیا گیا ہے کہ دستور بنانے کے بعد گروپ میں شامل کوئی صوبہ بھی اس میں شامل ہونے یا الگ رہنے کا فیصلہ صادر کر سکتا ہے۔ مسٹر جناح کا کہنا تھا کہ یہ سولت ہر صوبے کے اندیشہ کو رفع کر دیتی ہے کہ جس گروپ کے ساتھ وہ وابستہ کیا گیا ہے اس سے الگ ہو جائے، آسام کے کانگریسی لیڈروں کا کہنا تھا کہ دستور سے پہلے بھی ہر صوبے کو گروپ میں شامل ہونے یا نہ ہونے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ وہ اگر چاہے تو اپنا دستور جدا لگانہ طور پر بنا سکتا ہے۔ کابینہ وفد نے اس خیال کا اظہار کیا کہ گروپ بندی کے سلسلہ میں لیگ کا موقف درست ہے۔ آسام کے کانگریسی لیڈر بہر حال اپنی روش پر اڑے رہے اور کچھ تامل کے بعد گاندھی جی نے ان کی تائید شروع کر دی۔ معقولیت کا تقاضا یہ ہے کہ میں یہ اعتراف کر لوں کہ مسٹر جناح کے دلائل وزنی تھے۔ ۳ دسمبر کو برطانوی کابینہ نے ایک بیان شائع کیا جس میں گروپ بندی کے سلسلہ میں مسلم لیگ کے نقطہ نظر کی تائید کی گئی تھی لیکن اس کے باوجود مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان جو خلیج پیدا ہو چکی تھی وہ پانی نہیں جا سکی۔

جناب رئیس احمد جعفری کے مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب میں دیئے گئے حضرت قائد اعظمؒ کے ضمن میں تاثرات پر اپنے تجزیات یوں پیش کئے ہیں۔

”مولانا آزاد کی خود نوشت کے مختلف مقالات سے جو مرقع اس باب کی صورت میں تیار ہوا ہے وہ متعدد اعتبارات سے دلچسپ، سبق آموز اور قابل غور ہے، اس ہزار شیوہ بحث کے بعض پہلوؤں پر گفتگو با ضروری اور ناگزیر ہے۔

..... قائد اعظمؒ کی شخصیت کا صحیح اندازہ کر کے اگر گاندھی نے بار بار ان سے ملنے اور انہیں اپنا

ہم خیال بنانے کی کوشش کی تو اسے ”ہست بڑی سیاسی غلطی“ قرار دینے کے کچھ اسباب بھی مولانا کی نظر میں ہوں گے۔

مسٹر جناح نے جو خوب فائدے اٹھائے وہ گاندھی جی کی نیاز مندی کے باعث نہیں وہ جس طرح ایک سیاست دان تھے، اسی طرح ماہر نفسیات بھی تھے۔ وہ جانتے تھے کہ کس سے کس طرح گفتگو کرنی چاہئے۔ اسی چیز نے انہیں کامیاب بنایا، انہوں نے جو فائدے بھی اٹھائے اپنے لئے نہیں اپنی قوم کے لئے اور ان کا اٹھایا ہوا کوئی فائدہ بھی ایسا نہیں تھا جسے اخلاقی اور سیاسی اعتبار سے غلط اور ناوابہ قرار دیا جاسکے۔

۲..... ہندوستان کی سیاسی زندگی میں قائد اعظمؒ کو جو اہمیت حاصل ہوئی اور سیاست ہند میں انہیں جو عزت حاصل ہوئی نہ وہ گاندھی جی کا عطیہ تھی نہ گاندھی جی کی مکاری کا نتیجہ۔

یہ بھی غلط ہے کہ مسلمانوں کا ”بڑا“ طبقہ مسٹر جناح کی پالیسی کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتا تھا۔ مسٹر جناح کے مسلک اور خیال سے اختلاف رکھنے والا ایک گروہ تو بے شک مسلمانوں میں ہمیشہ موجود رہا اور اس گروہ کی تعداد میں کمی بیشی بھی ہوتی رہی، لیکن ہندو اور مسلم رہنما بلا اختلاف جس چیز پر ہمیشہ متحد رہے، وہ مسٹر جناح کا بے داغ کیریئر، ان کی دیانت فکر، اصابت رائے، بے لوثی اور دلیرانہ رویہ تھا۔

یہ میرا چشم دید واقعہ ہے، تاج محل ہوٹل بمبئی میں ایک عصرانہ تھا۔ اس زمانہ میں مسز نانائیڈو اکثر بمبئی میں رہتی تھیں اور ہوٹل کا ایک کمرہ ان کے لئے مخصوص تھا۔ عصرانہ میں زیادہ تر کانگریس کے سربراہ آوردہ مقامی اور غیر مقامی جو بمبئی میں اس وقت موجود تھے، یہ لیڈر شریک تھے۔

مسز نانائیڈو ایک بلند آہنگ خطیبہ، ایک شاعرہ شیریں نوا اور کانگریس کی اس وقت رہنما کی حیثیت سے مشہور تھیں۔ سب ان کا بڑا ادب لحاظ کرتے تھے، لیکن جب کسی محفل میں پہنچ جاتی تھیں، سب کا مذاق اڑاتی تھیں، حاضر و غائب رہنماؤں کا ایک ایسا خاکہ نجی محفلوں میں کھینچتی تھیں کہ بس۔ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ حد یہ ہے کہ گاندھی جی تک ان کے طنز لطیف کے تیروں سے نہیں بچتے تھے۔ باتوں باتوں میں مسٹر جناح کا ذکر چل نکلا، مخالفانہ اور معاندانہ رنگ میں، کیونکہ حاضرین میں ان کا ہم نوا شاید ایک ہی آدمی تھا مخالف سب تھے۔

دفعۃً مسز نانائیڈو چپ ہو گئیں، ان پر سنجیدگی طاری ہو گئی۔ انہوں نے کہا ”جناح کے بارے میں جو چاہو کہو، لیکن یاد رکھو، وہی ایسا شخص ہے جو خریدنا نہیں جاسکتا۔“

گاندھی جی اس حقیقت کے رمز شناس تھے، زیادہ صحیح حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی

قائد اعظم کے کردار و سیرت سے مرعوب تھے۔ وہ جانتے تھے یہ وہ شخص ہے جس نے ہمیں کے قدار اور جبار گورنر اور وائسٹنٹن سے اس وقت ٹکرائی اور رو در رو اسے ایسی ایسی سنائیں اور شرف آف ہمیں کے طلب کردہ الوداعی جلسہ کو درہم برہم کر دیا۔ جب کسی معمولی سارجنٹ کے سامنے بڑے بڑے ہندوستانی سول ماؤں کا پتہ پانی ہوتا تھا، وہ جانتے تھے، وہ جنات تھا جس نے ہوم رول کی تحریک اس شد و مد سے چلائی کہ تنزل در ایوان کسریٰ فدا، انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کے انہی شاندار اور لازوال کارناموں کی یادگار وہ ”جنال میوریل ہال“ ہے جو کانگریس نے اپنے صرف سے تعمیر کرایا تھا اور جس کی تعمیر کے بعد مسز نائیڈو نے مسٹر جنال کو جو لندن میں تھے تار دیا تھا، ”تیسہری زندگی ہی میں قوم نے اس کی قدر پہچان لی۔“

یہ وجہ تھی کہ گاندھی جی اس کے پیچھے پیچھے گھومتے تھے۔ ورنہ مولانا بھی اس ”سردل براں“ سے واقف ہیں کہ گاندھی جی وہ بت بے پیر تھے جنہوں نے محمد علی جیسے گاندھی ساز، شوکت علی جیسے مسیحا، کانگریس نریمان اور کھارے جیسے فدا یان کانگریس سے بیک چشم زدن رشتہ توڑ لیا اور دوسروں کا کیا ذکر خود مولانا سے ایک بار انہوں نے کہہ دیا تھا کہ آپ سے ناہنیں ہو سکتا۔ استعفیٰ دے دیجئے، بھلا ایسا شخص خواہ مخواہ مسٹر جنال کے پیچھے پیچھے گھوم سکتا تھا، اور مولانا نے یہ بڑی دلچسپ اور عجیب و غریب بات کہی کہ

”گاندھی کو مسٹر جنال کا تعاقب کرتے دیکھ کر بہت سے مسلمانوں کے دلوں میں ازسرنو مسٹر جنال کی عظمت پیدا ہو گئی۔“

جو مسلمان گاندھی جی کے اتنے عقیدت مند تھے کہ ان کی وجہ سے مسٹر جنال کی عظمت کے قائل ہو گئے، انہوں نے براہ راست گاندھی جی کے سامنے سر عقیدت کیوں نہیں جھکا دیا۔ مولانا نے شاید یہ کہتے وقت یہ نہیں سوچا کہ وہ کتنی مہمل بات ارشاد فرما رہے ہیں، اس سے یہی نتیجہ تو نکلتا ہے کہ گاندھی جی کی وجہ سے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقہ نے مسٹر جنال کو زعم کیر مانا اور مسٹر جنال کی وجہ سے گاندھی جی مخرف ہو گئے۔ مولانا کی قدیم و جدید منطق پر گہری نظر تھی۔ ان کا یہ ارشاد کس منطق کی ذیل میں آتا ہے! یہ وہی بتا سکتے تھے۔

۳ گاندھی جی نے مسٹر جنال کو ”قائد اعظم“ اس لئے لکھا تھا کہ وہ چاہتے تھے کہ قائد اعظم اپنے مراسلات میں انہیں ”مسٹر“ کی بجائے مامتا لکھا کریں۔ اپنے ایک خط میں گاندھی جی نے دے الفاظ میں ”من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی گو“ کا منظر پیش بھی فرمایا تھا۔ لیکن قائد اعظم نے یہ کہہ کر انہیں ساکت کر دیا۔ ”گلاب کے پھول کو جس نام سے بھی پکارو، وہ گلاب کا پھول ہی رہے گا۔“

۴..... قائد اعظمؒ کی پہلی اور آخری شرط یہ تھی کہ تم مسلمانوں کی انفرادیت تسلیم کر لو، ان کا حق خود ارادیت مان لو، اس کے بعد مسلمانوں کی جیب کی آخری پائی اور خون کا آخری قطرہ آزادی ہند کی راہ میں لے لو، مسلمانوں سے صلح کئے بغیر بظاہر انگریزوں سے لڑتے ہو، لیکن حقیقتاً مسلمانوں سے برسرِ پیکار ہو، مسلمان اتنے سادہ لوح نہیں کہ جنگ زرگری میں کسی فریق کا بھی ساتھ دیں اور اپنا نقصان کریں۔ اگر دیانتداری کے ساتھ مسلمانوں کی خیر سگالی اور تعاون کے متمکن ہو تو ان کے جائز اور مبنی بر انصاف مطالبات تسلیم کر لو، لیکن ان کو مطالبات تسلیم کئے اور انہیں مطمئن کئے بغیر آزادی کا نام لے کر انہیں دھوکا نہیں دے سکتے کم از کم وہ دھوکہ نہیں کھا سکتے۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ الفاظ کے طلسم میں اسیر کہ سردھڑکی بازی لگا دیتے تھے، لیکن اب وہ دور ختم ہو گیا، اب وہ حقیقت پسند ہیں اور اپنے مطالبہ میں اتنے ہی سخت اور بے لچک جتنے تم خود ہو۔

۵..... قائد اعظمؒ کا یہ اعتراض اتنا وزنی تھا کہ اس کا کوئی جواب نہ کاغذ پر دے سکی نہ صدر کاغذ پر۔ مولانا آزاد اور نہ فدایان کاغذ پر دے سکتے تھے، جو اہر لال اور سردار پٹیل۔

قائد اعظمؒ کو رے اور بے لاگ آدمی تھے، ان کا کہنا یہ تھا کہ واقعی (مکمل طور پر) کاغذ پر کابینہ سکیم کو تسلیم کرتی ہے تو اقرار کرے کہ وہ صوبائی گروپ بندی کو بھی تسلیم کرتی ہے اور دستور ساز اسمبلی بن جانے کے بعد اس موقف سے انحراف نہیں کرے گی، لیکن یہ اعتراف نہ کرنا اور منظوری کی رٹ لگائے جانا اس بات کا ثبوت ہے کہ کاغذ پر ”مکمل“ ذہنی تحفظ کے ساتھ اس سکیم کو منظور کرتی ہے اور موقع پاتے ہی پھر تاویلات بارہ کا سلسلہ شروع کر کے اپنے اس موقف پر آجائے گی کہ ہم گروپ بندی کو تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ آخر وقت تک کاغذ پر گروپ بندی تسلیم نہیں کی۔

کتنی عجیب بات تھی آسام جیسے چھوٹے چھوٹے صوبہ کے لئے جس کی آبادی چند لاکھ نفوس سے زیادہ نہیں، کاغذ پر عارضی طور پر بھی ”جبری“ طور پر بھی گروپ بندی میں اس شرکت پر رضامند نہیں تھی۔ صرف اس لئے متحدہ ہندوستان سے دستبردار ہو کر منقسم ہندوستان قبول کرنے پر باہزاراں حسرت و الم اسے مجبوراً ہونا پڑا، لیکن مسلم ہندوستان کو جس کی تعداد ۹ کروڑ کے لگ بھگ تھی، عارضی طور پر نہیں مستقل طور پر ہندوستان میں شرکت کرنے پر مجبور کر رہی تھی جو حق اس نے آسام کو دیا تھا وہ حق آج تک اس نے ۱۲ سال کی طویل مدت گزر جانے کے بعد بھی کشمیر کو نہیں دیا۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی جواب ہے اس اصول پرستی کا؟

۶..... مولانا آزاد نے کہیں تو قائد اعظمؒ کے دلائل میں وزن محسوس کیا۔

محقق گردید رائے بوعلی بارائے من

آزادی ہند۔ مصنف مولانا ابوالکلام آزاد

(ترجمہ، تلخیص، رئیس احمد جعفری، صفحہ نمبر ۳۶۵ - ۳۵۸)

مولانا ابوالکلام آزاد کی مذکورہ بالا کتاب سے یہ تمام اقتباسات درج کرنے کا مفہوم دراصل یہ تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد جو کہ کنز کا نگریسی تھے اور گاندھی کے دست راست، انہوں نے گاندھی اور قائد اعظمؒ کا جو تجزیہ کیا ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ ہر کیف وہ قائد اعظمؒ کی عظمت کردار، پر خلوص قیادت، بے باک سیاست اور شخصیت کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکے۔

شیر مسلم لیگ اور روبہ کانگریس

حضرت قائد اعظمؒ ایک بلند و بالا سیاسی اور قومی حیثیت کے مالک تھے، ایک ایسے درخت کی مانند تھے جو چٹانوں پر اگتا ہے اور اپنی خوراک سنگلاخ چٹانوں سے حاصل کرتا ہے، اپنی پوری قوت اور طاقت سے حاصل کرتا ہے۔ قائد اعظمؒ گملوں میں لگے پودوں کی طرح نہیں تھے جو ہر لمحہ اور ہر لحظہ مٹیوں کی توجہ اور احتیاط کے محتاج ہوں۔ خدا تعالیٰ نے انہیں ان کی اپنی اور خالصتاً اپنی محنت و مشقت اور شب و روز کاوشوں کے عوض انہیں ایک بلند ترین مقام ودیعت فرمایا تھا۔ ان کی ذات میں اور ان کے تمام تر سیاسی کردار میں کوئی بھی ایسی مثال نہیں ملتی، کہ جس سے یہ معلوم ہو کہ انہوں نے کسی کے زور بازو کے بل بوتے پر بلندی کے حصول کے لئے کاوش کی ہو۔

محترم بیدار ملک صاحب کی کتاب ”یارانِ مکتب“ جلد اول کا مطالعہ کر رہا تھا، ملک صاحب نے اس کتاب میں تحریک پاکستان کے نامور اسماء اور ان کے کوائف جمع کر دیئے ہیں۔ مطالعہ کے دوران جب میں جناب ڈاکٹر عمر حیات ملک کے سوانحی خاکے پر پہنچا تو مجھے سخت حیرت ہوئی کہ ملک صاحب وہ ہستی تھے جنہوں نے مسٹر گاندھی کو برصغیر میں متعارف کرایا۔ بیدار ملک صاحب رقمطراز ہیں۔

”بیسویں صدی کی دوسری دہائی کا ذکر ہے۔ موہن داس کرم چند..... ابھی مہاتما گاندھی نہیں بنے تھے، جنوبی افریقہ میں آباد اپنے ہم وطنوں کے حقوق کی لڑائی لڑتے ہوئے ایک باغی وکیل کے طور پر سیاسی افق پر ابھرے تھے۔ پردیس میں بدیلی حکومت کا غیض و غضب ناقابل

برداشت ہوا تو وطن واپس لوٹ آئے۔

موہن داس کرم چند کو اپنے ہی دیس میں اپنے نظریات کے اظہار کا کوئی راستہ نہ مل رہا تھا۔ اسی اثناء میں ان کی ملاقات اپنے ایک مسلمان ہم جماعت سے ہو گئی۔ انہوں نے کرم چند پر کرم کرتے ہوئے اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جانے کا مشورہ دیتے ہوئے انہیں جامع علی گڑھ کے ایک نوجوان پروفیسر کے نام ایک تعارفی خط دیا۔ یہ نوجوان اپنے زمانہ طالب علمی میں طلبہ یونین کا صدر رہ چکا تھا اور اب یونین کا ہر دلعزیز مشیر تھا۔ موہن داس جس شام علی گڑھ پہنچا ان کا میزبان یونین کی ایک تقریب میں شریک تھا۔ اسے ایک نوار دکی چٹ ملی تو وہ اسے ملنے ہال سے باہر چلا آیا۔ تعارفی خط سے اسے پتہ چلا کہ اجنبی کو ہندوستان میں اپنے تعارف کے لئے پلیٹ فارم درکار ہے۔ نوجوان اس مہمان کو ساتھ لئے ہال میں داخل ہوا۔ اس کے اشارے پر جلسے کی کارروائی کچھ دیر کے لئے رک گئی۔ پروفیسر نے اپنے مہمان کا بطور ”فریڈم فائٹر“ تعارف کرایا۔ ہال میں دیر تک تالیوں کی آواز گونجتی رہی۔ پھر اسے دعوت خطاب دی گئی۔ گویا گاندھی جی کے سیاسی سفر کا آغاز ہو گیا۔

جس نوجوان پروفیسر نے گاندھی جی کو یہاں متعارف کرایا۔ اس کا نام عمر حیات ملک تھا۔ اس وقت وہ ریاضی میں ایم ایس سی کرنے کے علاوہ ایل ایل بی کر چکا تھا۔ سرو کی مانند بلند و بالا قد، وقار کے ساتھ تنی گردن، ابھرا ہوا کشادہ سینہ، چہرے سے ٹپکتا ہوا رعب و دبدبہ، غرض مردانہ وجاہت کا ایک کوہ گراں، سرگودھا کے دور افتادہ گاؤں سنگھاں والی (اسے میانی بھی کہتے ہیں میں ۱۸۹۲ء میں پیدا ہوا)۔

(”یارانِ مکتب“ - مصنف: بیدار ملک، صفحہ نمبر ۲۳۳ - ۲۳۴)

محترم پروفیسر محمد منور مرزا صاحب کی تحریک پاکستان پر شہرہ آفاق تخلیق جس کا نام ہے ”Dimensions of Pakistan movement“ اس کتاب میں پروفیسر صاحب نے حضرت قائد اعظمؒ اور مہاتما گاندھیؒ کی تقابلی تجزیہ بے شمار حوالوں سے تحریر کیا ہے، انہوں نے لکھا ہے۔

”نیورلینکسن نے اپنی مشہور کتاب ”Virdict on India“ میں بعنوان (Dialogue with a giant) تحریر کیا ہے۔ کہ ”میں نے جناح کو ایشیا کا انتہائی اہم انسان تصور کیا ہے۔ اس لئے کہ وہ ذہن میں روشنی کی طرح رہتے ہیں، ان کے ضمن میں تو صیغی بیان پر بحث ہو سکتی ہے، لیکن یہ سب کچھ حقائق اور سچائی کے عین قریب ہے۔ ہندوستان آئندہ سالوں میں دنیا کا انتہائی اہم مسئلہ بننے والا ہے، لیکن جناح کی ایک شاندار اور مستحکم حیثیت واضح ہے

اور انہیں جنگ جیتی آتی ہے۔ جس طرح وہ بہتر تصور کریں اور اسلامیان ہند ان کے اشارے اور حکم پر دائیں بائیں مارچ کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار اور مستعد رہتے ہیں اور کوئی اس طرح نہیں کرا سکتا۔ یہی ایک نقطہ خاص ہے، لیکن ہندوؤں کے یہاں ایسا ممکن نہیں ہے، اگر گاندھی نہیں ہیں تو ان کی جگہ لینے کے لئے نہرو موجود ہے، ٹیل موجود ہے راج گوپال اچاریہ ہیں اور دوسرے بے شمار اور اگر جناح نہیں ہیں تو پھر اور کون ہے؟“

(ڈاکٹر مینشنز آف پاکستان موومنٹ، مصنف پروفیسر محمد منور، صفحہ نمبر ۳۴۵ - ۳۴۴)

ایس کے موجدگار گاندھی کی اس دیرینہ خواہش پر یوں روشنی ڈالتے ہیں کہ ”گاندھی ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں اقوام کی قیادت سنبھالنا چاہتے تھے، اور پھر یوں سارے برصغیر پر اپنی حکمرانی مسلط کرنا چاہتے تھے۔ لیکن وہ حضرت قائد اعظمؒ کے ضمن میں شاید ایسا نہ کر سکے تھے۔ وہ ناکام یوں رہے کہ وہ حضرت قائد اعظمؒ پر فتح حاصل نہ کر سکے۔ چنانچہ ایس کے موجدگار ساری تفصیل اس طرح بیان کرتے ہیں۔

”مہاتما گاندھی کی شخصیت میں ایک پیامبر اور ایک سیاستدان کے امتزاج نے انہیں ایک خوفناک قوت بنا دیا تھا۔ ۱۹۲۰ء سے وہ برصغیر پر چھائے رہے۔ جتنی بھی مخالف سیاسی قوتیں تھیں وہ بھی مطیع رہیں۔ سوائے جناح کے جو ان کے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھے۔ چنانچہ جناح ایک مضبوط و مستحکم حیثیت میں صرف اس لئے تھے کہ برطانوی حکومت اور برطانوی اہلکار ان سے تعاون کر رہے تھے۔ گاندھی کا خیال تھا کہ جیسے ہی برطانوی حکومت اور ان کے حامی عناصر ہندوستان چھوڑ دیں گے۔ وہ جناح کو شکست و ریخت سے ہمکنار کر دیں گے۔ برطانوی حکومت کے خاتمے کے ساتھ اور جناح کو شکست و ریخت کے ساتھ تمام ہندوستان گاندھی جی کے قدموں میں ہو گا، اور تمام برصغیر میں تمام تر حکمرانی ان کی ہوگی۔ ان کی اپنی راج پکڑورتی اور وہ ہندوستان میں گاندھی سلطنت کے پوپ ہوں گے۔“

(JINNAH AND GANDHI- BY: SK. MOJUMDAR P-176)

(”ڈاکٹر مینشنز آف پاکستان“ - مصنف پروفیسر محمد منور، صفحہ نمبر ۳۴۶ - ۳۴۵)

پیارے لال اپنی کتاب (MAHATMA GANDHI - THE LAST PHASE) میں تحریر کرتے ہیں۔ ”صبح ۸ بجے باپو ورنگل کیمپ کی میننگ میں شرکت کے لئے گئے اور مجھے انہوں نے کہا کہ وہ نوٹ پڑھیں جو انہوں نے پچھلی رات کرپس کے لئے لکھا تھا۔ چنانچہ انہوں نے مختصر سے خطاب میں کہا، ”میں اپنی شکست تسلیم کرتا ہوں۔ اور آپ میرے

بلا حمایت شک و شبہ پر عمل پیرا نہ ہوں۔ آپ صرف میری روحانی آواز پر عمل کریں اگر یہ آپ کے استدلال پر پوری اترتی ہیں، وگرنہ آپ اپنا راستہ خود متعین کر سکتے ہیں۔ اب میں آپ کی اجازت سے جانا چاہتا ہوں۔ آپ اپنی منطق کے مطابق عمل کریں۔ جمع سکتے ہیں آگیا، کچھ وقت کے لئے کوئی بول نہ سکا، مولانا صاحب نے موقع کے مطابق کمال ذہنی چستی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ کی مرضی اور خواہش کیا ہے؟ کیا باپو کو یہاں مزید روکا جاسکتا ہے۔ سب خاموش تھے، سب سمجھ گئے تھے۔ اس فیصلہ کن مرحلے میں باپو کی ان کو ضرورت نہیں تھی۔ انہوں نے پائلٹ کو گرانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ باپو اپنی رہائش کی طرف چل دیئے۔

یہ میٹنگ ۲۵ جون ۱۹۴۶ء میں قیام پاکستان سے ایک سال پہلے منعقد ہوئی تھی۔
 (”ڈالی مینشنز آف پاکستان“ - مصنف: پروفیسر محمد منور، صفحہ نمبر ۳۴۸)

رچرڈ ہوف نے اپنی کتاب (MOUNTBATTEN, HERO OF OUR

TIME) میں لکھا ہے جس میں انہوں نے حضرت قائد اعظم اور گاندھی کا موازنہ ان الفاظ میں کیا ہے۔

”در حقیقت سیاسی اعتبار سے گاندھی اپنا وقار و مقام کھو بیٹھے تھے، مگر یہ بات انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ لارڈ مونٹ بیٹن ہندوستان کے مہاتما سے قریبی تعلق اور دوستی رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس کے علاوہ دوسرے بڑے بڑے سیاستدانوں اور مدیرین نے بھی لارڈ مونٹ بیٹن کی محبت و شفقت اور خیر سگالی جو انہوں نے ہندوستان کے لوگوں کے لئے دل میں پیدا کی تھی، تسلیم کر رہے تھے، لیکن صرف ایک فرد متحدہ ہندوستان میں جو قابو میں نہ آسکا وہ جناح تھا۔ ”جناح مسلم لیگ تھا“ مونٹ بیٹن نے کہا جس کے ہاتھوں میں ہندوستان کا مستقبل تھا۔ میں نے یہی ترکیب ان کے ہاں بھی استعمال کی، لیکن جناح کو گرمانے میں میں ناکام رہا ان کا صرف ایک ہی خواب تھا، اور وہ خواب اسلامیان ہند کے لئے ایک علیحدہ آزاد وطن تھا۔“

(”ڈالی مینشنز آف پاکستان مونٹ“ - مصنف: پروفیسر محمد منور، صفحہ نمبر ۳۴۹)

ان حوالوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت قائد اعظم کو خریدنا، بسلانا اور پھسلانا کتنا مشکل تھا یہ حضرت قائد اعظم کی ذات کی جنگی، ان کے ایمان و ایقان کی غیر متزلزل کیفیت تھی، کہ انہوں نے انگریزوں کے ہر منصوبے اور سازش کے جال کو تار تار کر دکھایا۔ ان کے قول و فعل میں کمیوٹرائزڈ نتائج تھے۔ گلی لپٹی بات نہ پسند تھی اور نہ کرنے دیتے تھے۔ مومنانہ شان و شوکت اور عظمت کردار کے مالک تھے۔

قیادت کی جو بلند ترین مثال حضرت قائد اعظم نے قائم فرمائی وہ قیامت تک زندہ و پابندہ

ہے گی، اتنی بلند شخصیت، اتنا بلند کردار، اتنی وسعت قلب، اتنا زور خطابت، اتنی بے باکی، اتنی غیرت و حمیت، اتنا عزم و استحکام، اتنے بلند فکر، اتنے روشن ذہن کے مالک، تاریخ میں ایسے انسان نماں پیدا ہوتے ہیں۔

پاکستان کے پہلے وزیر اعظم جناب خان لیاقت علی خان اپنی ۱۲ ستمبر ۱۹۴۸ء کی نشری تقریر میں فرمایا۔ ”مجھے اس میں ذرا بھر شبہ نہیں کہ تاریخ قائد اعظمؒ کا شمار دنیا کی عظیم ترین ہستیوں میں کرے گی، دنیا میں کم آدمیوں کو یہ نصیب ہوا ہے کہ وہ ایک عظیم الشان کام کو ہاتھ میں لیں اور اپنی امت، عزم اور دانش سے اس کو اپنی زندگی میں ہی پروان چڑھائیں، قائد اعظمؒ نے نہ صرف پاکستان کا نصب العین مسلمانوں کے سامنے پیش کیا بلکہ اس کے لئے جدوجہد کر کے دنیا میں سب سے بڑی اسلامی ریاست قائم کر دی۔ قائد اعظمؒ ان برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جو دنیا میں بھی کبھی پیدا ہوتی ہیں۔ اپنی تمام سیاسی زندگی میں انہیں ملت اسلامیہ کی بہبود ہی منظور تھی اور وہ اسی کے لئے کوشاں رہے۔ اس کے ساتھ ہی ان کو خدا نے ایک ایسا آہنی عزم عطا کیا تھا جو کسی مشکل یا کاوٹ کی پروا نہ کرتے ہوئے انہیں اور قوم کو آگے لئے چلا جاتا ہے۔ وہ اپنے ارادے پر ایسی مستقل مزاجی سے قائم رہتے تھے جو ہر مسلمان کے دل میں جوش اور نصرت کے جذبات کو ابھارتا تھا۔ ان کی قیادت میں ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ کوئی مشکل ایسی نہیں جس پر ہماری ملت قابو نہ پا سکے گی۔

اس فہم اور سیاست، اس عزم و ارادے کے ساتھ ساتھ قائد اعظمؒ میں یہ خوبی بھی تھی کہ دن رات کام کر سکتے تھے اور کوئی فروعی چیز ان کی توجہ مبذول نہیں کر سکتی تھی۔ قائد اعظمؒ راولپنڈی سے آخر دم تک دن رات ملت کے لئے کام کرتے رہے، وہ ملت اسلامیہ کے لئے ہمیشہ مثال کا کام دے گی اور ہر فرد کے لئے مشعل ہدایت بنے گی۔“

ممتاز حسن احسن تحریر کرتے ہیں ”قائد اعظمؒ لندن میں صبح سات بجے سے پہلے اٹھتے تھے۔ سات بجے ان کے کمرے میں چائے پینچائی جاتی تھی۔ وہ آٹھ بجے تک کپڑے پہن اور اخبار ہ کر اپنی ڈاک دیکھ رہے ہوتے تھے۔ خورشید صاحب کو ان کی ڈاک کھولنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ ہر خط کو سب سے پہلے خود دیکھتے اور پھر یا خود اس کا جواب لکھتے یا اس پر کوئی حکم لکھ دیتے۔“

ان کی پوشاک نہایت اعلیٰ درجہ کی ہوتی تھی، ان کی وضع، انداز گفتگو اور طبیعت کی متانت۔ اس درجہ کی تھی کہ میں نے جب کبھی انہیں کسی بڑے سے بڑے برطانوی سیاستدان سے باتیں کرتے دیکھا، یہی محسوس ہوا کہ وہ ان کے برابر کا آدمی نہیں ہے۔ برطانوی وزراء کی شخصیت اور

ان کی قابلیت سے کوئی زیادہ متاثر بھی نہیں تھے۔

قائد اعظم کی گفتگو میں یہ خاص بات تھی کہ جو کچھ وہ کہتے تھے وہ نہایت واضح اور قطعی ہوتا تھا۔ ایک ایک لفظ کو صاف صاف اور علیحدہ علیحدہ ادا کرتے تھے، اور مخاطب تک اپنا مافی الضمیر اس خوبی سے پہنچاتے تھے کہ کسی غلط فہمی یا ابہام کا امکان نہیں رہتا ہے۔ پڑھتے وقت یا کسی خاص مسئلے پر غور کرنے کے دوران میں ان کی انگلیاں بے اختیار مانوکل کی طرف جاتی تھیں۔ وہ مانوکل پہنے ہوئے ایسے باوقار معلوم ہوتے تھے کہ تصویر اتارنے کو جی چاہتا تھا۔ ان کی مسکراہٹ میں ایک بے مثال دلکشی تھی، مگر کوئی شخص بغیر ان کے مسکرائے ان کے سامنے ہنس یا مسکرا نہیں سکتا تھا۔ ان کے ہاتھوں کی انگلیاں حسین تھیں اور وہ گفتگو کے دوران میں کسی بات پر زور دینے کے لئے اپنا مطلب واضح کرنے کے لئے اپنی انگلیوں کو حرکت دیتے تھے اور مخاطب کی طرف انگشت شہادت سے اشارہ کرتے تھے۔ آنکھوں میں ایک مقناطیسی چمک تھی۔ ان کی نظر ہر کام کے اصول کے علاوہ جزئیات پر رہتی تھی۔ ان کی طبیعت میں ایک سلیقہ اور ایک بانٹا بٹلی تھی۔ جس کی شہادت نہ صرف ان کے سیاسی کارناموں میں بلکہ ان کی روزانہ زندگی میں ملتی تھی۔“

رسالہ ماہ نو، کراچی، نومبر ۱۹۴۸

(مضمون: ”قائد اعظم“ کا ایک سفر، تحریر: ممتاز حسن احسن، صفحہ نمبر ۳۲)

جناب ایم اے حسین نے لکھا ہے،

”۶ جون ۱۹۴۱ء کے جلسے میں دوسری اہم بات جو جناب صاحب نے اس موقع پر کہی یہ تھی کہ مسلمانوں کے جائز مطالبات بھی اکثریت رکھنے والی قوم کے دل میں اس کی طرف سے بے اعتباری پیدا کر دیتے ہیں، یہ رویہ مناسب نہیں۔ اس موقع پر انہوں نے مصر کے زانغول پاشا کے ایک واقعہ کا ذکر کیا جس میں زانغول پاشا نے ایک صحیح عمل سے قبلی اور مصری مسئلہ کو ان سے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا۔ واقعہ یوں تھا کہ زانغول پاشا قبلی لیڈروں کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ اپنے مطالبات ایک کانڈ پر لکھ دو، قبلیوں نے اپنے مطالبات لکھ دیئے، زانغول پاشا نے ان مطالبات کو پڑھے بغیر انہیں لوگوں کے سامنے اس کانڈ پر دستخط کر دیئے۔ اس بات نے قبلیوں پر بڑا اثر کیا اور اعتبار اور بھروسہ کے اس معمولی سے عمل نے مصر کی موجودہ قوم کو ایک متحد قوم بنا دیا۔ اس کے برخلاف ہمیشہ مسلمانوں سے کوئی سودا کرنے اور سودے پر جھگڑنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ مسئلہ کو حل کرنے کا یہ طریقہ صحیح نہیں ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگ ایک دوسرے پر بھروسہ کریں۔“

یہ بات شاید اب بھی لوگوں کے ذہن میں ہوگی کہ جس زمانہ کا حال میں لکھ رہا ہوں۔ اس کے کچھ عرصہ بعد گاندھی جی نے ایک اعلان میں یہ کہا تھا کہ ”میں مسلمانوں کو ایک سودیشی قلم اور سودیشی کانغذ دوں گا کہ وہ اس کانغذ پر اپنے مطالبات لکھ دیں اور کانگریس کی طرف سے میں ان مطالبات کو جوں کا توں قبول کر لوں گا“ یہ وعدہ محض لفظی وعدہ رہا اور دوسری گول میز کانفرنس کے بعد کانگریس نے مسلمانوں کے ان مطالبات کو قبول کرنے کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ جنہیں ابھی چند دن ہوئے ”ہندوستان ٹائمز“ میں انتہائی جائز کہا گیا ہے۔

حالانکہ اس جلسہ میں جناح صاحب نے مسلمانوں کے نقطہ نظر اور مسلمانوں کے وفد طرز عمل کی ترجمانی بڑی قابلیت اور کامیابی سے کی تھی۔ لیکن ان کی پوری تقریر قومیت کے رنگ میں رنگی ہوئی تھی۔ انہوں نے مشترک انتخاب کی حمایت کی، اور اس بات پر زور دیا کہ ہم سب کو انگریزوں کے خلاف متحد ہونا چاہیے۔ لیکن انہوں نے اس موقع پر اس چیز کی وضاحت بھی کر دی کہ چونکہ عام طور پر مسلمان مشترک انتخاب کے حامی نہیں ہیں۔ اس لئے آئین میں جداگانہ انتخابات کا جزو لازمی ہے۔ جناح صاحب نے پورے مسئلہ کو اس قدر وضاحت اور منطقی انداز سے پیش کیا کہ کیمبرج کے دو نوجوان بھی جنہیں عموماً اپنی قابلیت کا پندار ہوتا ہے۔ ان سے وہی اناسیدہ سوال نہ کر سکے۔ اسی طرح جناح صاحب کی ذات کی بدولت کیمبرج مسلم ایسوسی ایشن کا پسلا جلسہ بے حد کامیاب رہا۔ اس بات سے ہمارے بعض ہندو دوست کچھ خوش نہ ہوئے اور ہم لوگوں کے تعلقات کچھ دن تک کشیدہ رہے۔ اگلے دن یعنی ۷ جون ۱۹۳۱ء کو کچھ مسلمان طالب علموں کی ملاقات سینٹ جان کالج میں چائے پر ہوئی۔ اور یہاں ذرا بے تکلفی سے باتیں ہوئیں۔ اس ملاقات میں جناح صاحب نے ہندوؤں کے ارادوں کے متعلق زیادہ یقین کے ساتھ شبھے ظاہر کئے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن جناح صاحب نے گاندھی جی کا ذکر برابر ”مہاتما جی“ کہہ کر کیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی کہا کہ ”آخر کو ہندو ہیں اور اس لئے ان کے لئے ہندوؤں کا مفاد باقی ہر مفاد سے بڑھ کر ہے۔“

(رسالہ ماہ نو، کراچی نومبر ۱۹۳۸ء)

مضمون ایک نئے دور کا آغاز، تحریر: ایم اے حسین، صفحہ نمبر ۵۰، ۵۱)

میں یہاں حضرت قائد اعظمؒ کے ضمن میں جناب رئیس احمد جعفری کے مضمون کو پیش کرنا چاہتا ہوں تاکہ قارئین کرام کو اپنے محبوب قائد کے بارے میں مزید بہتر معلومات حاصل ہو سکیں اور قائد اعظمؒ کی شخصیت، قابلیت و ذہانت اور سیرت و کردار کے مزید گوشے واضح ہو سکیں گے۔ ”ب رئیس احمد جعفری تحریر فرماتے ہیں۔“

لکھنؤ چیف کورٹ

جسٹس گوکرن ناتھ کی عدالت تماشائیوں سے قانون کے طالب علموں سے نو آموز و کیلور سے بڑے بڑے بیرسٹروں اور وکیلوں سے کچھا کچھ بھری ہوئی ہے۔ ریاست ناپارہ کا مقدمہ ملکیت زیر سماعت ہے۔ ایک فریق کے وکیل، مشہور انگریز دشمن، سابق صدر کانگریس اور ملک کے مایہ ناز قانون دان مسٹر حسن امام ہیں۔ دوسرے فریق کے وکیل، ہوم رول لیگ کے خالق، تلک اور گوکھلے کے مدد، دادا بھائی نوروجی کے چینیے، چند سال پہلے تک کانگریس کے روح رواں نیشنلسٹوں کے امام حاضر اور سروجنی نائیڈو کے الفاظ میں ”ہندو مسلم اتحاد کے سفیر“ مسٹر جناح ہیں خلقت انہی دونوں چوٹی کے وکیلوں کی بحث سننے آئی ہے۔

وہ دیکھتے جسٹس گوکرن ناتھ مصر اباصد جلال و تمکین تشریف لائے تمام حاضرین سرو قد تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے کارروائی شروع ہوئی۔ مسٹر حسین امام نے بحث کا آغاز کیا غرارے دار پاجامہ تزیب کا انگرکھا، سر پر دوپٹی ٹوپی زبان انگریزی، لب و لہجہ ہندوستانی۔

تقریر کیا تھی، فن و قانون کا بست بڑا دریا تھی۔ ایک سے ایک بڑھ کر دلیل، نئی نئی نظیریں، اچھوتے نکتے، زور بیان، حسن استدلال، شگوفہ کاریاں، زبان کی گلکاریاں، دلائل کی پرکاریاں، کیا کچھ نہیں تھا۔ حاضرین تو حاضرین، خود جسٹس گوکرن ناتھ کا یہ حال تھا کبھی ان کا مقدمہ عدالت میں بانگ دہل کی طرح گونجتا تھا، کبھی نگاہ حقیر، حسن استدلال کے بو سے لیتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ اور مسٹر جناح!

مسٹر جناح، خاموشی سے اپنی کرسی پر متمکن تھے، قہقہہ نہ تبسم، نہ پیوست نہ استکراہ، یہ معلوم ہوتا تھا، وقار و متانت اور دبدبہ و طنطنہ کا مجسمہ بیٹھا ہوا ہے۔ حسن امام کی تقریر ختم ہوئی، سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اب جناح کی باری تھی، نیچے تلے الفاظ پر زور لیکن باوقار لہجہ، وکیل مخالف کی ایک ایک دلیل، جو ابھی چند لمحوں پہلے تک پہاڑ کی طرح وزنی اور چٹان کی طرح مستحکم نظر آ رہی تھی، اب روٹی کے گالوں کی طرح کمرہ عدالت میں اڑ رہی تھی، جسٹس گوکرن ناتھ اب تک باغ و بہار بنے ہوئے تھے، ہنستے بھی تھے اور ہنساتے بھی تھے، اب یکسر فکر و استغراق نظر آرہے تھے۔ حسن امام نے دو گھنٹہ سے زیادہ تقریر کر کے ایک طلسم باندھا تھا اور اس طلسم کشا نے آدھے گھنٹے کی مختصر تقریر میں، لیکن جامع و مانع تقریر سے اسے ختم کر کے رکھ دیا۔

ایک تاثر کے عالم میں عدالت برخواست ہوئی اور لوگ، اس وقت تک اس دہلے پتے لیکن آہنی انسان کو دیکھتے رہے، جب تک اس کی کار بلٹر پیلس، مہاراجہ محمود آباد کے دولت کدے کی

سرفرواہ نہیں ہو گئی۔

انڈین سبجیکٹو اسمبلی: سر عبدالرحیم کر سی صدارت پر رونق افروز ہیں۔ کمیونل ایوارڈز زیر بحث ہے۔ حکومت اور کانگریس پارٹی، اپنی اپنی تائید و حمایت کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہیں حکومت چاہتی ہے کہ اصلاحات جدیدہ سے متعلق رپورٹ جوں کی توں منظور کر لی جائے، کانگریس چاہتی ہے اسے یکسر مسترد کر دیا جائے مسٹر جناح اصلاحات کے مخالف ہیں، لیکن کمیونل ایوارڈ کے حامی ہیں۔ ایک حد تک وہ حکومت کا ساتھ دینا چاہتے ہیں اور ایک حد تک کانگریس

۹۔

سر سرکار نے لاممبر اور لیڈر آف دی ہاؤس کی حیثیت سے ایک معرکہ آرا تقریر میں حکومت کے نقطہ نظر کی شکایت کی۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسی نے وضاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے۔ کانگریس کی ترجمانی کی۔ سرکار کی تقریر۔ خطابت اور جوش بیان کا نمونہ تھی۔ ڈیسی کی تقریر تدلل اور منطق کا شاہکار تھی۔ اب جناح، حقیقت پسندی کے حربے سے مسلح ہو کر کھڑا

۱۰۔

جناح کی تقریر دو دھاری تلوار تھی۔ جو برق جاسوز بن کر فرنگی سامراج کے خرمن حیات پر رہی تھی۔ اور ساتھ ہی ساتھ وہ ہندو، امپیریلزم کے گلوئے مشکبو پر بھی پڑ رہی تھی، جناح نے حکومت سے مخاطب ہو کر کہا۔ تمہاری فیڈرل سکیم مکروفریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ تم ہندوستان کی روح سے قدیم ہند کی نفسیات سے، ہندو اکثریت کی سرشت سے اور اقلیتوں کے حال زار سے واقف ہو ہر مرتبہ جب تم اصلاحات کا متن تیار کرتے ہو، تمہارے پیش نظر صرف سامراجی فرائض و مقاصد ہوتے ہیں پھر وہ ڈیسی کی طرف مخاطب ہوئے اور انہوں نے گرجتی ہوئی آواز میں کہا، اگر تم میں اتنی وسعت قلب، اور عالی ظرفی نہیں ہے کہ اقلیتوں کے ساتھ باعزت سمجھوتہ کر سکو، ان کی شکایات رفع کر سکو، ان کے مطالبات منظور کر سکو۔ ان کے احتیاجات پورے کر سکو۔ تو انہیں حکومت کا پیش کردہ کمیونل ایوارڈ منظور کرنا پڑے گا۔ اگر تم واقعی سچائی اور صداقت کے ساتھ حکومت کو شکست دینا چاہتے ہو تو آؤ ہم سے سمجھوتہ کرو۔ ورنہ ہم اصلاحات مسترد کر دیں گے۔ اور ایوارڈ منظور کر لیں گے۔ اصلاحات اس لئے مسترد کر دیں گے کہ وہ ملک کے لئے بہ حیثیت مجموعی مملکت ہیں اور ایوارڈ اس لئے منظور کر لیں گے کہ اس کے سوا کوئی چارہ کار ہی نہیں ہے۔

اس تقریر کا رد عمل یہ ہوا کہ حکومت کی اکڑی ہوئی گردن اور اکڑ گئی اور کانگریس کی دن میں خم آ گیا۔ حکومت اپنی روش پر اڑی رہی اور کانگریس کمیونل ایوارڈ کے معاملے میں غیر

جانبدار ہو گئی دو ٹنگ ہوئی توفیح جناح کی تھی۔ یعنی اصلاحات کی رپورٹ مسترد اور کمیونل ایوارڈ منظور۔

نظام دکن کا گیسٹ ہاؤس۔ لارڈ ویول وائسرائے ہند نے مسلم لیگ کی تجاویز ماننے سے معذوری ظاہر کی ہے۔ مسٹر جناح نے ان سے جنگی سرگرمیوں میں ان سے اور ان کی حکومت سے تعاون کرنے سے انکار کر دیا ہے۔ وائسرائے ایک جنگی کونسل بناتے ہیں اور اس کی ممبری کے لئے مسلم لیگ کی بعض سربراہان اور وہ شخصیتوں، سرسکندر حیات خان وزیر اعظم پنجاب اور نواب صاحب چھتاری وغیرہ سے سازش کرتے ہیں۔ اور انہیں ممبری پر راضی کر کے سرکاری اعلان کر دیتے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ نظام دکن کا فرمان شائع ہوتا ہے۔ جس کی رو سے نواب صاحب چھتاری کی وزارت عظمیٰ کا اعلان کیا جاتا ہے۔

شاہی گیسٹ ہاؤس سے مسٹر جناح ایک بیان شائع کر کے وائسرائے کو ان کی کامیاب سازش پر مبارک باد دیتے ہیں اور مذکورہ تمام اصحاب کے مسلم لیگ سے اخراج کا اعلان کرتے ہیں۔

یہ اعلان سن کر دنیا دنگ رہ جاتی ہے۔ سکندر حیات اور فضل الحق، سعد اللہ سلطان احمد اور چھتاری اگر مسلم لیگ سے نکال دیئے گئے تو رہ کیا جائے گا؟

ہم اٹھ گئے تو کیا تری محفل میں رہ گیا!

لیکن قائد اعظمؒ اپنے فیصلہ پر قائم ہیں۔ لوگ غمتیں کرتے ہیں، التجائیں کرتے ہیں اصرار کرتے ہیں کہ فیصلہ واپس لے لیں۔ لیکن جناح کے ”نو“ (No) کو ”ہاں“ (Yes) سے کوئی نہ بدل سکا۔

اور آخر کار سکندر حیات اور سعد اللہ اور چھتاری توبہ کر کے اپنے گروہ سے تائب ہوتے ہیں۔ باقی اپنے مسلک پر قائم رہتے ہیں اور ان کا جو حشر ہوا اسے کون نہیں جانتا۔

مسلم لیگ کونسل کا اجلاس۔ حکومت برطانیہ نے ایک مرتبہ پھر مسلم لیگ سے بدعہدی کی۔ کابینہ مشن کی تجاویز مسترد کر دیئے اور حکومت کا تشریحی بیان، نہ ماننے کے باوجود مسلم لیگ نظر انداز کر دی گئی اور کانگریس کے بغیر تشکیل وزارت کی اسے اجازت نہیں دی گئی۔

ان بدلے ہوئے حالات پر غور کرنے کے لئے آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا ایک جلسہ بمبئی کے قیصر باغ ہال میں منعقد ہوتا ہے قائد اعظمؒ ”کری صدارت پر جلوہ فرما ہیں۔

بڑے پر جوش انداز میں مباحثہ ہو رہا ہے۔

گر مئی گفتار، رعنائی مجالس الاماں:- کسی گوشے سے سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو رہی

ہے، کوئی مقرر زمین و آسمان نہ وبلا کئے دے رہا ہے، کسی زبان میں خنجر کی روانی ہے کسی کے الفاظ میں تیر و نشتر کی چیمیں، کسی کے نعرہ میں زلزلہ کی گرج، اور کسی کی گرج، ستارہ شکن اور آسمان گیر! قائد اعظمؒ سب کی سن رہے ہیں، کبھی تبسم، کبھی سکوت، تبسم میں سنجیدگی اور سکوت میں فکر کے آثار نمایاں!

دوسرے روز قائد اعظمؒ کی مرتب کی ہوئی سرکاری تجویز پیش ہوئی، کابینہ مشن کی تجاویز مسترد، ڈائریکٹ لیکشن کا فیصلہ، ابتدائی اقدام سرکاری خطابت کی واپسی۔

خطابت کی واپسی کی تحریک، خلافت اور کانگریس کی پر آشوب تحریکوں کے زمانہ میں بھی اٹھی تھی۔ لیکن قائد اعظمؒ کی ولولہ انگیز اور معرکہ آراء تقریر نے فضا بدل دی لوگ جو ”فرزندِ دلبند سلطنت انگلستان“ سمجھے جاتے تھے سب سے پہلے اٹھے اور انہوں نے اس طوقِ لعنت کو گلے سے اتارنے کا ہر سرعام اعلان کر دیا۔ جوشِ اعلان اتنا بڑھا ہوا تھا کہ مائیکروفون تک پہنچنے کے لئے بڑے خان بہادروں اور سروں کی قطار لگی ہوئی تھی کہ کب ہمارا نمبر آئے اور ہم ترکِ خطاب کا اعلان کریں۔

سرفیروز خان نون، سر غلام حسین ہدایت اللہ، سر سعد اللہ خان، سر ناظم الدین، نواب زادہ لیاقت علی خان، راجہ غضنفر علی خان، نواب اسماعیل خان، سب ہی تھے۔ جو خطاب واپس کرنے کے لئے لپک رہے تھے۔ جو جوشِ خطاب حاصل کرنے کے لئے لوگوں میں ہوتا ہے۔ اس سے کہیں زیادہ خطاب واپس کرنے کا تھا۔

فیض یہ کس کا کرامت کس کی تھی؟

کیا قائد اعظمؒ کے سوا، کوئی دوسرا نام بھی لیا جاسکتا ہے؟

یہ کہانی بڑی لمبی ہے، نہ کہنے والے کا جی بھرے گا، نہ سننے والے کا۔

ورق تمام ہوا، اور مدح باقی ہے

سفینہ چاہئے اس بحرِ بیکراں کے لئے

(رسالہ ماہ نو، کراچی قائد اعظم نمبر نومبر ۱۹۳۸ء)

مضمون: قائد اعظمؒ کی کہانی تحریر رئیس احمد جعفری صفحہ نمبر ۵۳، ۵۴)

یہ تھی وہ حضرت قائد اعظمؒ کی قائدانہ شان و شوکت، ان کے کردار کی بلندی، ان کے خطیبانہ لہجے کا کمال، پر عزم سیاست، پر استقامت سیادت، مومنانہ لگن، اور غازیانہ انداز۔ ان کے انہی اوصاف کی وجہ سے کیا دشمن کیا دوست، کیا غیر کیا اپنے ادب و احترام سے سر جھکائے جتے تھے۔ مگر ان کا سر صرف باری تعالیٰ کے حضور جھکنا جانتا تھا۔ ان کا لہجہ تیر قضا کی طرح سیدھا،

ان کی گردن، تیر قضا کی طرح سیدھی۔ ان کے نظریات و تخیلات تیر قضا کی طرح سیدھے، ان کی گفتگو میں اثر انگیزی، ان کی چال میں اثر آفرینی تھی۔ تاریخ ہند میں کیا بالکل شخصیت پیدا ہوئی تھی۔

ہمیں دکھ اور افسوس ہے تو اس بات کا کہ اس قدر عظیم المرتبت قائد کی زندگی، ان کے اقوال زرین اور ان کی خدمات بے مثل پر جتنا کام ہونا چاہئے تھا وہ نہیں ہو پایا ہم قیام پاکستان کے اغراض و مقاصد کو بھی بھولے بیٹھے ہیں۔ مقاصد قیام پاکستان کے بعد ختم ہو گئے اور اغراض باقی رہ گئیں۔

وہ قائد اعظم۔ جنہوں نے اپنا سب کچھ اپنی قوم کی فلاح و بہبود اور آزادی و سلامتی کے لئے قربان کر دیا۔ وہ قائد اعظم۔ جنہوں نے اپنی قوم سے ذاتی غرض کے لئے کبھی ایک پائی بھی طلب نہ کی۔ جنہوں نے اپنی جوانی اپنی کملی، اپنا حسن و جمال، اپنی عیش و عشرت اور اپنی صحت و تندرستی سب کچھ اپنی قوم کے لئے داؤ پر لگا دیا تھا۔ دوسری طرف ہندو قائدین کا عالم یہ تھا، خواہ ان میں نہرو ہوں یا گاندھی۔ سب کانگریس کے ملازم تھے۔ ان کی تنخواہیں بندھی ہوئی تھیں۔ سالانہ بھستہ ملا کرتا تھا بلکہ یہاں تک کہ گاندھی کی بکریاں بھی کانگریس کے پیسے پر پلا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود ان کی قوم نے انہیں سر پر بٹھایا اور آج تک پرستش کرتی ہے۔ بحیثیت ہندو قائد اور لیڈر جتنا گاندھی کا پروپیگنڈہ کیا گیا ہے اتنا شاید دنیا میں کسی لیڈر کا نہیں ہو گا۔

حضرت قائد اعظم۔ جب بمبئی سے مرکزی اسمبلی دہلی میں اسمبلی سیشن کے لئے جاتے تھے تو سپیش ٹرین میں سپیش بوگی ریزرو کراتے تھے اور ان کا عملہ ان کے ساتھ ہوتا تھا ٹرین کا اور اپنے تمام عملے کا خرچہ خود برداشت کرتے تھے۔ اور جب وفات پائی تو لاکھوں روپے اپنے عزیزوں، رشتہ داروں، اپنے سکولوں اور تعلیمی اداروں کو وقف کر گئے۔ یہ تھا وہ کردار، یہ تھی وہ انسانی بلندی، یہ تھی وہ قربانی، یہ تھا وہ ایثار، تو کیوں نہ یہ کہا جائے کہ وہ تنہا ابا خلاق اللہ کے سچے اور پکے امانت دار تھے، ان میں کون سی انسانی صفت نہیں تھی جو ان میں موجود نہ تھی، کیا یہ اولیائے کرام جیسی صفات نہیں تھیں، کیا اس طرح کا وطیرہ اور انداز زندگی خدا تعالیٰ کے خاص بندوں کا نہیں ہوتا۔ یہ سعادت انہی کو ہی نصیب ہوئی۔ اور پاکستان انہی کے ہاتھوں معرض وجود میں آیا۔ جو ایک معجزے سے کم نہیں۔

علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا۔

دل بینا بھی کر خدا سے طلب
آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

حضرت قائد اعظمؒ اور گاندھی کا ایک تجزیاتی مطالعہ اپنے طور پر ایک انتہائی اہم اور ضخیم کتاب کا تقاضا کرتا ہے۔ مگر میں نے چند صفحات پر اکتفا اس لئے کرنا ضروری تصور کیا ہے کہ اس موضوع پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ لہذا چند مختصر اشارات سے یہ کتاب تحریر کی ہے حضرت قائد اعظمؒ اور گاندھی، بچپن سے لے کر جوانی، جوانی سے لے کر بڑھاپا، بڑھاپے سے آخری سانس تک۔ ان دونوں شخصیات کا زندگی کے ہر موڑ اور ہر انداز سے مطالعہ ایک بہت دلچسپ مطالعہ کا نام ہے۔ اس گہرے مطالعے، تجزیے اور تقابل سے یہ سب کچھ واضح ہوتا ہے کہ کون کہاں کھڑا تھا، کون کیا تھا، کون جیتا، کون ہارا، کون شیر مسلم لیگ اور کون گرہ کا نگریں تھا۔ حیرت ہے کہ آنے والی تاریخ کے روحانی اور تمدنی دھارے یہ سوچ سوچ کر پریشان بھی ہوتے ہوں گے اور مسکراتے بھی ہوں گے۔ کہ ایک ہی برصغیر میں، ایک سی فضا اور ایک سے جغرافیائی ماحول میں اور ایک ہی برطانوی ادارے سے قانون پڑھ کر پروان چڑھنے والی شخصیات کس طرح تاریخ کو ترتیب دیں گی۔ اور تاریخ تحریر کرنے والے، تاریخ تخلیق کرنے والوں کے بارے میں کیا تاثرات و مشاہدات پیش کریں گے۔

گاندھی پر ایک مستندار معتبر کتاب جس کا نام ہے۔ ”گاندھی اے سٹڈی ان ریولوشن“ Gandhi-A Study of Revolution

جسے جیوفری الیش نے لکھا ہے۔ گاندھی کی تمام تر زندگی پر ایک بھرپور کاوش ہے اس کتاب میں مصنف گاندھی خاندان کے بارے میں تحریر کرتا ہے۔

”یہ درست ہے کہ ان کا خاندان ملازمت کرتا تھا، وہ ہندو تھے۔ اور گاندھی خاندان کا تعلق کوئی اعلیٰ ذات سے نہ تھا، ہندوؤں کی چار ذاتیں تھیں۔ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر، جو کہ مزید جھوٹی چھوٹی ذاتوں میں منقسم تھے۔ گاندھی کا تعلق نظریاتی لحاظ سے انتہائی متوسط طبقے سے تھا۔ بنیاد کا مفہوم تجارت پیشہ لوگ تھے۔ گاندھی، جو پورے ہندوستان میں ایک عام نام تھا، جس کے معنی سبزی فروش، پرچون فروش تھا، چنانچہ خاندانی پس منظر کے اعتبار سے ان کا یہی پیشہ تھا، لیکن ذات کے لیبل کے اعتبار سے کوئی اوتہم چند اور اوتہم گاندھی، پور بندر کا وزیر اعظم بن گیا۔

اوتہم غیر معمولی غیرت و حمیت کا مالک تھا، چنانچہ اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا یا جلا وطن کر دیا گیا۔ چنانچہ اس کے چھ بیٹوں میں سے پانچویں کا نام کرم چند یا کابا تھا۔ کابا بھی پور بندر کا وزیر اعظم رہا، اور تقریباً ۲۰ سال کی ملازمت و خدمت کے بعد وہ راج کوٹ اور وٹکانیر پر یکے بعد دیگرے بھی وزیر اعظم رہا۔ جب وہ راج کوٹ گئے۔ تو ان کے ایک بھائی کو پور بندر کا

انچارج بنا دیا گیا۔ راج کوٹ میں کابا اپنی خاندانی معیار اور اخلاقی جرات کے مطابق رہنے کی کوشش کرتا رہا، انہوں نے شہزادے کو، اپنے چیف کو، برطانوی پولیٹیکل ایجنٹ سے محفوظ رکھنے کی ہر ممکن کوشش بھی کی۔ اور کبھی کبھار نظر بند بھی رہے۔

اس کی دفتری حیثیت تملق اور سازش سے میرا تھی۔ اس کے علاوہ اس کے برعکس وہ کوئی مضبوط و مستحکم کردار کا مالک نہ تھا۔ ایک موقع پر اس کے تینوں ریاستوں میں علیحدہ علیحدہ مکانات تھے۔ اس کے ہاں بچت کا کوئی تصور نہ تھا و نکانیر کی وزارت عظمیٰ سے کچھ حاصل نہ ہوا تھا، اور یوں اس نے سب کچھ خیرات پر بھی لگا دیا تھا، اور اس سلسلے میں اس کا نظریہ یہ تھا کہ بچوں کے لئے کچھ بنا جانا ایک بری حرکت ہے۔ جذباتی، متلون مزاج اور جنسی خواہشات کا دلدادہ تھا۔

اکتوبر ۱۸۶۹ء میں وہ پور بندر میں رہ رہا تھا، چنانچہ اس مہینے کے دوسرے دن اس کی چوتھی اور آخری بیوی پتلی بانی نے اس کے چوتھے اور آخری بچے کو جنم دیا، اور یہ بچہ، مستقبل کا گاندھی تھا۔ ایک دست شناس نے انہیں اس بچے کا نام موہن داس کرم چند تجویز کیا۔

Gandhi-A Study in Revolution

By: Geoffery Ashe P-3

گاندھی کے بچپن کے دنوں کے احوال کے بارے میں جیوفری ایش تحریر کرتے ہیں۔
 ”اپنے ہی خاندان کے ایک لڑکے کی ہمراہی میں گاندھی اپنے چچا کے سگریٹوں کے کونے اکٹھا کیا کرتے تھے، اور پھر انہیں بیا کرتے تھے، وہ چھپ چھپا کر پیتے تھے۔ یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کے والدین اس چیز پر اعتراض کریں گے۔ اس کے بعد انہوں نے یہ کیا کہ اپنے نوکر کی جیب خریج کی رقم چرائی اور مکمل سگریٹ خریدی، اس طرح کی پابندیوں کی وجہ سے انہوں نے ایک دو مرتبہ خودکشی کرنے کی بھی ناکام کوشش کی۔“

(مذکورہ بالا کتب کا صفحہ نمبر ۷)

”مہتاب نامی لڑکا گاندھی کو مزید روشن خیالی کی طرف لے گیا۔ یہاں تک کہ اسے قحبہ خانے کی سیر بھی کرائی جسے بعد میں گاندھی نے بہت برا تصور کیا۔ انہی دنوں میں گاندھی نے اپنے بھائی کے سونے کی چین چرائی، اور ان کا قرض اتارنے کی کوشش کی، جس کا اسے کوئی علم نہ تھا۔“

۱۸۸۵ء میں ایک خوفناک حادثے نے اس کے اخلاقی رجحان کو استحکام بخشا، کابا قریب المرگ تھا کستور بانی (مہاتما گاندھی کی بیوی) حاملہ تھی، موہن داس ایک رات اپنے باپ کی مالش کر رہا تھا، مگر اس کا ذہن کہیں اور تھا۔ جب اس کے چچا نے اسے آرام کے لئے کہا، تو وہ بھاگ کر

اپنے سونے کے کمرے میں گیا۔ اور کستور بائی پر سوار ہو گیا۔ حالانکہ وہ اس وقت سو رہی تھی۔ کستور بائی حمل کے آخری دور سے گزر رہی تھی۔ جس وقت کہ مناسب نہیں تھا، ایک نوکر نے اسے بلایا، کہ کابا مر رہا ہے، قبل اس کے گاندھی اپنے باپ کے کمرے تک پہنچتا۔ کابا مر چکا تھا۔ اس بیٹے کو چھوڑ کر جسے اس وقت اپنے باپ کے پاس موجود ہونا چاہئے تھا۔ —
(مذکورہ بالا کتاب، صفحہ نمبر ۱۱)

اسی کتاب میں آگے چل کر مصنف تحریر کرتے ہیں کہ ”مہاتما گاندھی راج کوٹ کے مسائل میں دلچسپی لینے لگے۔ جب طاعون پھیلنے لگا تو انہوں نے پبلک ہیلتھ کمیٹی کو اپنی خدمات پیش کیں۔ چنانچہ وہ بیت الخلاؤں کی انسپکشن پر لگے رہے۔ اور ان مسائل میں انہیں حسب معمول بہت زیادہ دلچسپی رہتی تھی جس کا پورپ کی بجائے ہندوستان میں بہت ادراک کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ان کے نزدیک امراء زیادہ صحت و صفائی کا خیال نہیں رکھتے، اور نہ ہی تعاون کرتے ہیں۔ البتہ صاحب ستھری رہائش تو صرف اچھوتوں کی ہے، لہذا ایسا انسپکشن کرنا ضروری گردانا نہیں جاتا“

(مذکورہ بالا کتاب، صفحہ نمبر ۶۹)

”خیالوں میں جنس پرستی کوئی بہتر عمل نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ جسم کے ذریعے ہو اگر اس طرح کے خیالات ابھریں تو بہتر ہے کہ انہیں کنٹرول کیا جائے۔ اگر ایسا ممکن نہ ہو تو پھر بہتر ہے کہ جسم کی بھوک دور کر دی جائے۔“

(مذکورہ بالا کتاب، صفحہ نمبر ۹۴)

(مہاتما گاندھی نے ایک مرتبہ اپنے آپ کو جھٹلایا۔ جان ہالینڈ (John Hoyland) میں گاندھی کے انگریز دوست تھے، انہوں نے کستور بائی کے حوالے سے گاندھی کے اعتراف کو اس طرح ریکارڈ کیا۔

”میں نے عدم تشدد کا سبق اپنی بیوی سے سیکھا، اس (کستور بائی) کی مستحکم رکاوٹ جو میرے ارادے پر ہوا کرتی تھی ایک طرف تھی۔ اور دوسری یہ کہ وہ میری حماقتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیا کرتی تھی۔ جس نے مجھے آخر کار اپنے آپ سے شرمندہ کر دیا تھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے اپنی حماقتوں کی اصلاح کرنے پر سوچنا شروع کر دیا۔ چونکہ کستور بائی پر حکمرانی میرا حق تھا، لیکن بالآخر وہ میری عدم تشدد کی استاد بن گئی۔ اور یہ سبق مجھے جنوبی افریقہ میں کام آیا۔“

(مذکورہ بالا کتاب، صفحہ نمبر ۱۸۲)

”رام کرشن کی یادیں اب ان کے ذہن میں تلاطم خیز تھیں، اور جب کہ وہ پریشانی کے عالم میں تھے، تو ان کی زندگی میں ایک پرسکون پسندیدگی در آئی۔ ان کا تجرباتی مزاج کے مطابق، وہ اپنے آپ کو اس وقت بھی حسین کستور ہائی کے ساتھ اسی سونے کے کمرے میں محسوس کرتے تھے، ایک دوسرے کے پاس خاموش مصاحبت میں آرام کر رہے ہوں۔“

(مذکورہ بالا کتاب، صفحہ نمبر ۲۶۱)

(ونسٹن چرچل نے گاندھی کے بارے میں بڑے شراغیز اور بدقسمتی پر مبنی ان کے کردار کے بارے میں فقرے استعمال کئے ہیں۔ ”یہ خبردار کرنے والا اور کرہ عمل ہے کہ گاندھی کو دیکھا جائے، ایک باغیانہ درمیانے درجے کا وکیل، جو اپنے آپ کو ایک فقیر کی شکل میں رکھتا ہے، جیسا کہ مشرق میں ممکن ہو سکتا ہے۔ جو آدھانگا وائسریگل پیلس میں آتا ہے۔ اور اس کے باوجود وہ گستاخانہ لہجے کے ساتھ معاشرتی حکم عدولی کو اپنائے ہوئے ہے۔ اور برطانوی شہنشاہ کے نمائندے کے ساتھ گفت و شنید کرتا ہے۔“

Gandhi A Study in Revolution

By Geoffrey Ashe.P296

ان مختصر حوالہ جات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مہاتما گاندھی کا قد کاٹھ کیا تھا، اصلیت و حقیقت کیا تھی، یہ مختصر حوالے صرف اس لئے دیئے گئے ہیں۔ تاکہ موضوع زیادہ طویل نہ ہو جائے۔ وگرنہ مذکورہ بالا کتاب میں گاندھی پر ایک مستند اور حقیقت پسندانہ تجزیہ ہے جو سب کا سب تحریر کرنا خاصا مشکل ہے۔

حضرت قائد اعظمؒ کی سوانح پر تحریر کرنے والے، مشرقی اود مغربی مصنفین کیا اپنے اور کیا پرائے۔ اس طرح کے تصورات و خیالات نہ رکھتے تھے۔ انہیں ضدی اور ہٹ دھرم تو ضرور سمجھا جاتا رہا۔ اور یہ بھی خصوصاً ان مغربی مصنفین کی آراء تھیں۔ صرف اس لئے کہ وہ ان کے دام فریب میں نہ آسکتے تھے۔ مسلمانان ہند اور ان کی فلاح و بہبود، ان کی آزادی و خود مختاری ان کے یہاں سب سے زیادہ عزیز شے تھی۔ ان کی شخصیت پر کشش، ان کا لباس اعلیٰ درجے کا، ان کے بوٹ خوبصورت، ان کی عادات و اطوار ستھری ستھری، نکھری نکھری، زندگی اور اس کے انداز کے بارے میں بڑے واضح، آنکھوں میں نور کی شعاعیں۔ جس نے ایک مرتبہ ہم کلام ہونے کا شرف حاصل کیا ہے، وہ انہی کا ہو کے رہ گیا، اللہ تعالیٰ نے کس بلند ضمیر و خمیر کا انسان پیدا کیا تھا۔

فاطمہ جناح اپنی کتاب ”میرا بھائی“ میں تحریر کرتی ہیں۔

”محمد علی کو بمبئی کے انجمن الاسلام سکول میں داخل کرا دیا گیا۔ کچھ عرصے تک محمد علی نے اپنی کتابوں پر سنجیدگی سے توجہ دی۔ چنانچہ انہوں نے گجراتی کی چوتھی جماعت پاس کر لی۔ اس طرح وہ انگریزی کی پہلی کلاس میں داخلہ لینے کے اہل ہو گئے۔ ادھر والدہ کا اپنے چیتے بیٹے کی جدائی میں برا حال تھا بالآخر ماں کی محبت باپ کی منطق پر غالب آگئی اور محمد علی بمبئی سے کراچی واپس آ گئے۔

میرے والد نے انہیں ایک مرتبہ سندھ مدرسۃ الاسلام میں داخل کرا دیا سکول کے رجسٹر کے مطابق اس مرتبہ ان کا داخلہ نمبر ۱۷۸ تھا۔ ۲۳ دسمبر ۱۸۸۸ء تاریخ داخلہ تھی۔ گزشتہ تعلیمی ادارے کے خانے میں انجمن الاسلام سکول بمبئی کا نام درج ہے۔

اب تک محمد علی کو جنون کی حد تک گھڑ سواری کا شوق ہو چکا تھا۔ میرے والد کے پاس سواری کے لئے کئی بگھیاں تھیں، جو اس زمانے کے مطابق سواری کا ایک ریسلسہ ذریعہ تھیں، موٹر کاروں کا دور ابھی بہت دور تھا۔ میرے والد کے اصطبل میں کئی شاندار گھوڑے تھے، محمد علی نے جلد ہی گھڑ سواری سیکھ لی۔ وہ اس کھیل سے بے حد محفوظ ہوتے تھے۔ سکول میں ان کے ایک دوست ہوا کرتے تھے کریم قاسم۔ جو کھارادر ہی کے ایک تاجر کے بیٹے تھے۔ دونوں لڑکے روزانہ دور تک گھڑ سواری کیا کرتے تھے۔

محمد علی اپنے گھوڑوں سے پیار کرتے تھے جو گردن تان کر سیدھے کھڑے ہوتے تھے، اور طاقت اور خود اعتمادی کے مظہر ہوا کرتے تھے، انہوں نے دیکھا کہ فطرت کے قاعدے کے تحت زندگی ہمیشہ عمودی خطوط پر استوار ہوتی ہے گھوڑے سیدھے اور تن کر کھڑے ہوتے ہیں، درختوں کا حال بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ شاخوں پر پھول عموداً کھلتے ہیں، انسان سیدھا کھڑا ہو کر چلتا ہے اسی طرح پرندے اور درندے بھی۔ گنبد اور مینار آسمان کو چھو لینے کی تمنا کرتے ہیں۔ انہوں نے زندگی میں اصول بنالیا کہ وہ نہ صرف سامنے دیکھیں گے بلکہ اپنا سر بھی بلند رکھیں گے۔ وہ مشکلات کے آگے نہیں جھکیں گے بلکہ ان کا چیلنج قبول کر کے ان پر قابو پا لینے کی جدوجہد کریں گے۔ وہ صنوبر کے اونچے درخت کی مانند بنیں گے کہ طوفان جیسے چھو سکتے ہیں۔ مگر جھکا نہیں سکتے۔

وہ سکول میں اپنے دن امتحان میں کامیابی کی کوششوں میں گزارنے لگے۔ ان کی شائیں گھڑ سواری کے لئے وقف تھیں۔ مگر تبدیلی کی جانب ان کا رجحان ایک بار پھر غالب آیا۔ اور انہوں نے اپنے والد سے کہا کہ وہ انہیں کسی دوسرے سکول میں داخل کرا دیں۔ کچھ بحث و مباحثہ کے بعد میرے والد نے ایسا کرنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

”اب ان کی عمر پندرہ برس ہو چکی تھی اور میرے والد اپنے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں فکر مند ہونے لگے۔ انہیں حیرت ہوتی تھی کہ آخر ان کا بیٹا کیا بنے گا۔

گراہمز ٹریڈنگ کمپنی کے انگریز جنرل نیجر نے جواب تک میرے والد کا بہت اچھا دوست بن چکا تھا۔ پیش کش کی کہ وہ نوخیز محمد علی کو لندن میں اپنی فرم کے صدر دفتر میں تین سال کے لئے اپرنٹس کے طور پر بھیجوا سکتا ہے۔ وہاں اسے کاروبار کا نظم و نسق چلانے کی عملی تربیت دی جائے گی، یہ تربیت لندن سے واپسی پر محمد علی کے لئے اپنے والد ہی کا کاروبار سنبھالنے میں بہترین معاون ثابت ہوگی۔ جنرل نیجر کو یقین تھا کہ اس مرحلے پر یہ نوجوان اپنے والد کے لئے بہت بڑا اثاثہ ثابت ہو گا اور وہ کاروبار کو مزید پھیلانے میں والد کا مددگار بنے گا۔ اس تجویز پر خوشحال تاجر کا دل بے حد خوش ہوا جو قائل ہو چکا تھا کہ لندن میں ایسے بھرپور عملی تجربے کے بعد ان کا بیٹا خاندانی کاروبار میں یقیناً چند نئی اور منافع بخش راہوں کا اضافہ کرے گا۔

مگر ان کے لئے اصل مسئلہ یہ تھا کہ اس کام پر کتنا روپیہ صرف ہو گا جس کے بعد طویل عرصے کے دوران تو شاید ان کے خاندان کو فوائد حاصل ہوں۔ مگر بیٹے کو اس قسم کی تربیت دلانے سے فوری طور پر فائدے کی بہر حال کوئی امید نہ تھی میرے والد نے اپنے انگریز دوست سے پوچھا کہ کراچی سے لندن تک سفر کے اخراجات کے علاوہ لندن میں قیام و طعام پر انہیں ماہانہ کس قدر رقم خرچ کرنا پڑے گی۔ متوقع اخراجات کے اعداد و شمار کا تفصیل اور احتیاط سے جائزہ لیا گیا۔ اگرچہ تین سال کے دوران خرچ کی جانے والی مجموعی رقم خاصی تھی مگر والد نے فیصلہ کیا۔ کہ وہ میسرز گراہمز کے پاس لندن میں یہ رقم پیشگی جمع کرا سکتے ہیں۔ تاکہ ان کا بیٹا اپنی تربیت تسلسل کے ساتھ جاری رکھ سکے۔“

مگر میری والدہ بدستور اپنے موقف پر قائم تھیں، وہ اپنے لاڈلے بیٹے کو تین برس کے لئے کس طرح خود سے جدا کر سکتی تھیں، والد نے انہیں سمجھایا کہ محمد علی کو لندن بھیجنا نہ صرف خود ان کے نوجوان بیٹے کے بلکہ خاندانی کاروباری فرم جناح پونجا اینڈ کمپنی کے بھی مفاد میں ہو گا۔ ان کے نزدیک کسی غیر شادی شدہ نوجوان کو انگلستان بھیجنا خطرے سے خالی نہیں ہو سکتا تھا۔ خاص طور پر محمد علی جیسے خوب و نوجوان کا غیر شادی شدہ حالت میں وہاں جانا بالکل ٹھیک نہیں تھا، والدہ کو اندیشہ تھا کہ محمد علی انگلستان میں کسی انگریز لڑکی سے شادی نہ کر لیں، اور اگر ایسا ہوا تو یہ جناح پونجا خاندان کے لئے ایک سانحہ کا باعث ہو گا۔ والد ان کے دلائل سے متفق ہو گئے۔ مگر اب سوال یہ اٹھا کہ محمد علی کی شادی کہاں کی جائے۔

میری والدہ کے پاس اس سوال کا جواب پہلے ہی تیار تھا۔ وہ پانیلی کے ایک اسماعیلی خوجہ

خاندان کو جانتی تھیں۔ جن سے ان کی دور کی رشتہ داری تھی۔ ان کی ایک لڑکی ایبی بائی شادی کے سن کو پہنچ چکی تھی، والدہ کے خیال میں وہ محمد علی کی دلہن بننے کے لئے بالکل موزوں تھی۔ میرے والد کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ مگر والدین نے مناسب سمجھا کہ وہ اپنے بیٹے کو بھی اس فیصلے سے آگاہ کر دیں۔ اس زمانے میں بچوں کی شادیاں والدین ہی طے کیا کرتے تھے۔ لڑکی اور لڑکے کے پاس بڑوں کا فیصلہ قبول کر لینے کے سوا کوئی اور دوسرا راستہ نہیں ہوتا تھا۔ یقیناً والدین جانتے تھے کہ ان کے بچے کے لئے کیا بہتر ہے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق انہوں نے ایک فرمانبردار بیٹے کی حیثیت سے اپنے والدین کا فیصلہ قبول کر لیا۔ اس طرح ان کی منگنی پانیلی کی ایبی بائی سے ہو گئی۔

(میرا بھائی، مصنفہ: فاطمہ جناح، صفحہ ۳۰، ۳۶)

نظر نہ آنے والے سفید دھاگوں پر پروٹی پھولوں کی لمبی لمبی لڑیوں میں سر سے پاؤں تک چھپے ہوئے محمد علی پانیلی میں اپنے دادا کے گھر سے دولہا بن کر بارات کے جلوس کے ہمراہ اپنے ہونے والے سسرال کے گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ جہاں چودہ سالہ ایبی بائی قیمتی نئے لمبے اور بھاری بھر کم زیورات پہنے، ہاتھوں میں مندی رچائے دلہن بنی بیٹھی تھی۔ اس کے لباس اور چہرے پر نہایت قیمتی عطر چھڑکا ہوا تھا، گاؤں کے مولوی نے رسم نکاح ادا کی قرآن پاک سے چند آیات کی تلاوت کی گئی اور یہ دونوں میاں بیوی بن گئے۔

(میرا بھائی، مصنفہ: فاطمہ جناح۔ صفحہ نمبر ۳۸)

”میری والدہ بیٹے سے تین سال کی جدائی کے تصور ہی سے کھوئی کھوئی رہتی تھیں، ان کے لئے یہ بہت طویل عرصہ تھا۔ مگر انہوں نے اس جدائی کو محمد علی کی بہتری کے خیال سے قبول کر لیا تھا۔ انہوں نے اس سے کہا ”میرے بیٹے مجھے تم سے جدا ہونا پسند نہیں۔ مگر مجھے یقین ہے کہ انگریز جاکر تم بڑے آدمی بن جاؤ گے، یہ میری زندگی کا خواب ہے۔“ ان کا بیٹا خاموشی سے ماں کی باتیں سنتا رہا۔ انہوں نے کہا۔ ”محمد علی تم ایک طویل سفر پر جا رہے ہو۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ میں تمہیں انگریز سے واپس آتا دیکھنے کے لئے زندہ نہیں رہوں گی“ اور اس کے بعد وہ سسکیاں لے لے کر رونے لگیں۔ محمد علی نے جذباتی ہو کر والدہ کو گلے لگالیا۔ میری والدہ نے بیٹے کو الوداع کہا۔ ”محمد علی، خدا تمہاری حفاظت کرے گا، وہ میری خواہش ضرور پورا کرے گا۔ تم بڑے آدمی بنو گے اور مجھے تم پر فخر ہو گا۔“

(میرا بھائی۔ مصنفہ: فاطمہ جناح، صفحہ نمبر ۴۰، ۴۱)

”قائم کی عمر تقریباً ۱۸ برس تھی، جب وہ اپنی ماں اور اپنی بیوی سے محروم ہو

چکے تھے اور اب وہ جان چکے تھے کہ ان کا عمدہ خاندانی کاروبار جسے ان کے والد نے بے پناہ محنت اور جاں فشانی سے کھڑا کیا تھا۔ تباہی کے کنارے پر پہنچ چکا تھا بعض اوقات زندگی کے بڑے بڑے صدمات اور ٹھوکریں بعض افراد کی غیر معمولی اور خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر دیا کرتی ہیں۔ قائد نے اپنے خاندان کے نام روشن کرنے کے لئے ان مصائب اور نقصانات کا مقابلہ یونانی فلسفی زینو کے ایک پیروکار کی سی جرات سے کیا۔ اور کامیابی کا عزم کیا۔ اب انہوں نے اپنا نام بدل کر ”ایم اے جناح“ کر لیا۔

بنک کی پاس بک سے پتہ چلتا ہے کہ مسز ایف سی بیج ڈریک کو معاوضے پر رہنے والے مہمان کی حیثیت سے دس پونڈ ماہانہ ادا کرتے تھے۔ بعد کے دنوں میں وہ کہا کرتے تھے کہ مسز بیج ڈریک ایک مہربان بوڑھی خاتون تھی جس کا کنبہ کافی بڑا تھا۔ وہ خاص طور پر ان سے بڑی محبت کرتی تھی اور انہیں اپنے بیٹے ہی کی طرح سمجھتی تھی۔ مسز ڈریک کی ایک انتہائی حسین و جمیل بیٹی تھی، جو قائد کی ہم عمر تھی۔ خو برو مس ڈریک میرے بھائی سے بہت التفات رکھتی تھی۔ مگر وہ اس ٹائپ کے نہیں تھے جو اس قسم کے معاشقوں وغیرہ میں خود کو ملوث کرتے۔ جب کہ مس ڈریک میرے بھائی پر خصوصی توجہ دیتی تھی۔ وہ ہر وقت ان کا دل جیتنے کی کوشش میں لگی رہتی تھی۔ مگر وہ ہمیشہ اس کے ساتھ قابل احترام حد تک فاصلہ رکھتے تھے۔ مس ڈریک کبھی کبھی اپنے گھر میں مخلوط پارٹیاں بھی کرتی تھی اور ان میں دوسرے کھیلوں کے ساتھ ساتھ وہ اپنے مہمانوں کے لئے مغربی انداز کے اس خصوصی کھیل کا بھی اہتمام کرتی تھی جس میں کسی خاص جگہ پر چھپنے والے کے پکڑے جانے کی صورت میں جرمانہ کی صورت میں بوسہ لینا پڑتا تھا، مس ڈریک کی مسلسل ترغیبات کے باوجود قائد بوسہ بازی کے اس کھیل میں کبھی شامل نہ ہوئے۔ قائد نے مجھے بتایا ”کرسمس کا موقع تھا اور ڈریک خاندان اسے روایتی جوش و خروش سے منارہا تھا۔ جیسا کہ عیسائی خاندانوں میں رواج ہے آکاس بلیں گھروں کے دروازوں پر لٹک رہی تھیں جن کے نیچے ان لوگوں کو ایک دوسرے کا بوسہ لینے کی اجازت ہے میں اس رسم سے بے خبر نہیں تھا اور اتفاق سے ایک آکاس بیل کے نیچے کھڑا تھا کہ مس ڈریک نے مجھے پکڑ کر گٹھے لگالیا اور مجھ سے کہا کہ میں اس کا بوسہ لوں۔ میں نے اس کی سرزنش کی اور کہا کہ ہمارے معاشرے میں نہ تو ایسا کیا جاتا ہے اور نہ ہی اس کی اجازت ہے مجھے خوشی تھی کہ میں اس کے ساتھ اس انداز میں پیش آیا تھا۔ کیوں کہ اس روز کے بعد مجھے اس کی نخرے بازی کی الجھن سے نجات مل گئی۔“

(میرا بھائی۔ مصنفہ فاطمہ جناح، صفحہ نمبر ۵۱، ۵۰)

محمود فاروقی صاحب نے کیا خوب تحریر کیا ہے۔

”جیسا کہ سب جانتے ہیں گاندھی بنیوں کی روایتی تاجرانہ ذہنیت کا بے عیب مظہر تھا۔ اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ ایٹ انڈیا کمپنی کے تاجروں کی چالاک نسل سے معاملہ کرنے میں گاندھی جیسی شخصیت ہی کی ضرورت تھی جو باٹ پائنگ کی سیاست کے امور سے اتنا ہی باخبر تھا جتنا یہ سمندر پار کے تاجر حکمران تھے۔ اس معاملہ میں کھلے دل سے اعتراف کر لینا چاہئے کہ اگر گاندھی نہ ہوتا تو ہندوستانی سیاست کی ترازو پر آزادی کا سودا چکانے میں شاید نصف صدی اور نکل جاتی۔ گاندھی نے ہماری غلامی کے پچاس برس بچائے۔ ایک ملک پر ایک شخص کا اس سے بڑھ کر اور کیا احسان ہو سکتا ہے۔ بہر حال ہندوستانی سیاست کے اس وقت کے کینوس پر ہم کو دو چالاک اور ہوشیار تاجر اجتماعی مقدرات میں سے ایک اہم ترین مقدر کا سودا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس سودے کا جزو لاینفک مگر زائد اوزان پائنگ مسلمان قوم ہے جو ان دونوں سے سودا بازی میں فیصلہ کن قدر بنی ہوئی ہے۔ دونوں اس کو اپنے اپنے پلڑے میں ڈال لینے کے لئے بڑے فنکارانہ لین دین میں مصروف ہیں۔ اس وقت کانپور کی مسجد شہید گنج سے لے کر تحریک خلافت کے آخری سٹیج تک سارا ملک مسلمانوں کے والمانہ پر جوش نعروں سے گونج رہا تھا اور ان کے قدموں کی چاپ سمندر پار دور دور تک پہنچ رہی تھی مگر اصل سودا بازار کے اس شور و شغب سے دور ایک جانب سرد اور خاموش فضا میں ان دو تاجروں کے درمیان طے پارہا تھا جہاں باہر کے یہ ہنگامے کسی سورت اثر انداز نہیں ہو سکتے تھے۔

اس پس منظر میں ذرا اپنی یادداشت کو تازہ کر کے سوچئے اس پس پردہ فنکارانہ سودا بازی میں مداخلت کرنے، دونوں فریقوں کی مسلمہ قدروں کو پرانگندہ کر دینے، ایک نیا معیار رد و بدل بنوانے اور اس طرح مسلمانوں کے پائنگ کو اپنے ہاتھ میں لے لینے کے لئے کس مزاج کس ڈھب اور کن صلاحیتوں کے انسان کی ضرورت تھی؟ کیا محمد علی جوہر کا آتش زیر پاھیولی اور ان کی گرجتی و نجاتی قیادت اس کی متحمل ہو سکتی تھی کیا ظفر علی خان کا سیما پامزاج اور ان کی تند بھکڑوں والی مخالفت مناسب حریف بننے کے قابل تھی، آزاد مرحوم اور مولانا مدنی کا کیا ذکر یہ دونوں تو سادہ دستاویز پر دستخط کر کے اپنی اور اپنی قوم کی ہنڈی گاندھی کے ہاتھ تھما چکے تھے اور بچا احسرت سوبانی وہ تو بس بادِ سموم کا ایک بے قرار جھوٹا تھا جو سارے ہندوستان میں مارا مارا پھر رہا تھا۔ اب نون رہ گیا تھا چند پنجاب کے اور چند بنگال کے رہنما مگر ان کا ذہنی افق اپنے اپنے صوبہ کی حد تک ہی وسیع تھا اس سے آگے نہیں۔ اس موقع پر سات کروڑ کی یہ کثیر العیال قوم ایک فرزند کی آرزو میں بے قرار تھی۔

وہ آرزو پوری ہوئی اور جناح صاحب سامنے آئے۔ ان کی چال جتنی نبی تلی تھی ان کا مزاج

بھی اتنا ہی نپا تلا تھا۔ جیسے وہ ”پیدا“ نہ ہوئے ہوں بلکہ کسی قدمولے کے تحت پورے حساب کتاب، اجزاء کے توازن، مقدار اور اعداد کے تناسب کے ساتھ ”تیار“ کئے گئے ہوں ایک ساختہ پر داختہ شخصیت جو کبھی بے ساختہ وجود میں نہیں آ سکتی۔ انہوں نے سودا بازی کی اس ٹھنڈی اور سخت میز پر کئے نہیں مارے، ہنگامہ نہیں کیا، شور نہیں مچایا، چپچپے چلائے نہ منہ سے جھاگ اڑایا۔ وہاں باتیں کہیں تو تول تول کر، خاموش رہے بھی تو حساب کتاب سے، کیونکہ وہ اپنے قدموں کی گنتی اور اپنی نشست کے زاویہ سے جس قدر باخبر رہتے تھے اتنے ہی وہ اپنے دہانہ کے ناپ اور باتوں کے حجم سے بھی واقف تھے۔

گاندھی کے لئے یہ محمد علی جوہر، ظفر علی خان، ابوالکلام آزاد، حسرت موہانی، حسین احمد مدنی سے مختلف شخصیت تھی۔ اسی کی طرح ٹھنڈی ٹھوس، جلد اور ہٹ دھرم اس کو کس طرح دھوکہ دیا جاسکتا تھا وائسرائے نے دیکھا تو وہ اسے ”دارالعوام“ ہی نہیں بلکہ ”دارالامراء“ کی دھج کے آدمی نظر آئے لئے دیئے سرد مہر پروقاد اور سخت کار لگانے والے، ان کو کس طرح جھکایا جاسکتا تھا۔ دونوں اس میز پر ایک تیسرے شخص کے وجود کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ بس یہی وہ ایک پہلی شکست تھی جو جناح نے گاندھی کو دی اور آئندہ کی چند در چند کامیابیوں کا راستہ کھول دیا۔

تفصیل کا یہ موقع ہے کہ نہ انداز بیان متحمل، مختصر کہ جب جناح صاحب جہاں سے اٹھ کر اپنی قوم کے پاس آئے تو ان کے ہاتھ میں جداگانہ قومیت ملک کی سیاسی تقسیم، ایک جداگانہ تہذیبی وطن کے تنصیبات اور تحفظات تھے۔ ہندوستان کی سیاسی جدوجہد میں یہ کارنامہ جو جوش میں لانے والا نہیں بلکہ متحیر کر دینے والا تھا صرف جناح صاحب کے لئے مخصوص تھا اور وہ اس کے لئے ”پیدا“ نہیں بلکہ بنائے گئے تھے۔ اپنے اس کارنامہ کے ذریعہ انہوں نے مسلمان قوم کو مزید ایک سیاسی علامی سے بچالیا۔ ایک قوم پر ایک شخص کا اس سے بڑھ کر اور کیا احسان ہو سکتا۔

(اردو نامہ — مجلس زبان و فنی، حکومت پنجاب، اپریل ۱۹۹۲ء)

(مضمون ہر گاندھی راجناح (خاکہ)

نخبر محمود فداوتی صفحہ ۳۳، ۳۴ ایس عبد اللطیف کی کتاب The Great Leader ”دی گریٹ لیڈر“ کے مطالعے کے بعد یہ محسوس ہوتا ہے کہ حضرت قائد اعظمؒ اور گاندھی کیا تھے اور حضرت قائد اعظمؒ کی شخصیت و کردار کتنا بلند تھا۔ جناب ایس عبد اللطیف نے یہ کتاب ۱۹۳۶ء میں لکھی۔ اس کتاب میں فاضل مصنف نے حضرت قائد اعظمؒ اور گاندھی کا

زندگی کے ہر پہلو اور ہر انداز سے جس طرح حقیقت پسندانہ اور بے لاگ تبصرہ کیا ہے۔ وہ نہایت قابل ستائش ہے۔ ان دو بڑے زعمائے کرام کے ضمن میں یہ کتاب انتہائی اہمیت کی مالک ہے۔ گو اس ساری کتاب کے اقتباسات کا یہاں ذکر بہت مشکل ہے۔ لیکن چند ایک حوالے دے کر قارئین کرام پر یہ واضح کروں گا کہ برصغیر کے ان دو عظیم سیاست دانوں کا قد کاٹھ کتنا تھا، اور حضرت قائد اعظمؒ کس طرح بلا شک و شبہ عظیم المرتبت حیثیت کے مالک تھے۔

”انگلستان میں نوجوان جناح کے چار سال، تاریخ کا ایک اہم ترین حصہ قرار پائے ہیں۔ دادا بھائی نوروجی کی کاوشوں سے اور ان کے نوجوان ساتھیوں کی وجہ سے ہندوستان برطانوی سیاست میں چمکا۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۸۹۲ پاس ہوا تھا۔ اس کی وجہ سے انتخابی بنیاد پر انڈین پروفیشنل کونسلز کو وسعت دی گئی۔ جس سے ہندوستان دستوری ترقی کی راہ پر گامزن ہو گیا۔ جان بل کا خیال تھا کہ ہندوستان اور ہندوستانیوں کو بہتر سلوک سے ہمکنار کیا جائے چنانچہ رائے عامہ، ہندوستان کے باشندوں کی وجہ سے ہموار اور متاثر ہوئی۔ دیگر ہندوستانی طلباء کی طرح نوجوان جناح نے بھی اپنا کردار ادا کیا۔ دادا بھائی نوروجی لندن میں انڈین سوسائٹی کے بانی صدر تھے، اس سوسائٹی کے باعث بہت سے ہندوستانی طلباء کھینچے چلے آئے ان پر یہ واضح کرو یا گیا کہ ان کو اس مرحلے میں شامل کرنا دراصل ہندوستانی سیاسی کشش میں حصہ ادا کرنا ہے۔ اس دوران میں ایک نئے ہندوستان کی تخلیق کا سلسلہ محسوس کیا گیا۔“

جب کہ مسٹر جناح اس انتہائی ترقیاتی ماحول میں رہ رہے تھے اور اس سے لطف اندوز بھی ہو رہے تھے۔ مسٹر گاندھی نے اس کے برعکس دو سال پہلے بے کیف اور عدم توجہی کی زندگی بسر کی۔ مسٹر گاندھی نے کتابوں کے مطالعے پر بہت محنت کی اور غذائیت کے ضمن میں حقائق پر مبنی تجربات کئے۔ اس کے برعکس مسٹر جناح کی زندگی بالکل مختلف حیثیت رکھتی تھی۔ مسٹر جناح کے سوانح نگار مسٹر مطلوب الحسن سید نے ایک مرتبہ اپنے قائد سے پوچھا کہ اس زمانے میں لنکمنان کا کورس یا سلیبس کیا تھا، انہوں نے مزاح کے رنگ میں فرمایا کہ یہ ”میں ڈنر یا اس سے کچھ زیادہ نہیں تھا جو ایسے زعمائے کرام کے لئے یا مستند و کلاء کو دیئے گئے ہوں۔“ جب کہ ”بونہ“ گاندھی، اپنی تعلیم کے دوران کوئی خاص کامیابی سے ہمکنار نہ ہوا تھا۔ حالانکہ وہ بہت محنت مشقت سے کام کرتے تھے۔ ان کے برعکس ”دیوقامت“ حضرت قائد اعظمؒ ہمیشہ تعلیم کے میدان میں امتیازی حیثیت حاصل کیا کرتے تھے۔

گاندھی اپنے بچپن کے زمانے میں انگریزی ڈانس کا سوانگ بھرا کرتے تھے۔ تو حضرت قائد اعظمؒ اپنے بچپن کے زمانے میں ڈرامے میں بڑی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ وہ شیکسپیرین ڈراموں تک

کلب کے ممبر بھی رہے اور یہ سارا سلسلہ شوقیہ تھا۔ نوجوان جناح ٹیکسیسیئر سے متاثر تھے تو ان کے برعکس گاندھی گیتا میں ڈوبے رہتے تھے۔“

(دی گریٹ لیڈر: مصنفہ ایس عبداللطیف صفحہ نمبر ۱)

”حضرت قائد اعظمؒ جب بمبئی میں تھے تو انہوں نے خوب کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اور مسٹر گاندھی بمبئی سے راج کوٹ بھاگ گئے اور بعد میں جنوبی افریقہ کا سفر اختیار کیا۔ اور وہاں ”قلی وکیل“ بن گئے، جناح نے ابتدائی محنت سے فخر حاصل کی۔ اور مسٹر گاندھی ہار گئے۔ مسٹر جناح کا فرمان تھا کہ کردار، جرات، محنت اور تحمل و تدبیر، چار ایسے ستون ہیں جن پر تمام زندگی کی عمارت کا دار و مدار ہوتا ہے، ناکامی کا لفظ میرے ہاں نہیں ہے۔“ وہ پولین کی طرح گر جتے تھے۔ مسٹر گاندھی کے ہاں اس طرح کا فلسفہ حیات نہیں ملتا۔“

(دی گریٹ لیڈر: مصنفہ ایس عبداللطیف، صفحہ نمبر ۲۱)

”جب گوکھلے جنوبی افریقہ گئے۔ وہ اپنا سکارف ساتھ لے گئے جو انہیں مہادیو گوند ریڈیڈ نے دیا تھا جسے وہ خصوصی تقریبات میں استعمال کرتے تھے۔ ایسی ہی تقریبات میں ایک تقریب وہ تھی جس میں جوہنبرگ کے ہندوستانی باشندوں نے ان کو کھانے پر دی تھی، سکارف پر استری کی ضرورت تھی، اس وقت سکارف کو لانڈری بھیجنے کا وقت نہیں تھا۔ چنانچہ مسٹر گاندھی نے اپنی خدمات پیش کیں۔ گوکھلے نے کہا کہ ”میں بحیثیت وکیل آپ کی حیثیت پر تو ایمان رکھتا ہوں، لیکن بحیثیت ایک دھوبی کے نہیں“

یقیناً گوکھلے کو غلط فہمی ہوئی تھی۔ مسٹر جناح نے کہا، مسٹر گاندھی نے بذات خود بھی کہا ہم مسٹر گاندھی کی حیثیت کو بحیثیت دھوبی تو تسلیم کر سکتے ہیں۔ لیکن بحیثیت ایک وکیل نہیں۔ گوکھلے نے بھی یہ بات تسلیم کر لی ہوگی۔ کیونکہ گاندھی نے ان کا سکارف خوب صورت استری کیا تھا، حالانکہ وہ عدالت میں اس طرح بہترین کارکردگی کا مظاہرہ نہ کر سکتے تھے۔

(دی گریٹ لیڈر: مصنفہ ایس عبداللطیف صفحہ نمبر ۲۸-۲۹)

سٹیٹلے والبرٹ اپنی کتاب Jinnah of Pakistan میں رقمطراز ہیں۔ ”ایک مین سے بھی کم وقت ہوا تھا، گاندھی نے جناح کو خط لکھا کہ انہیں (جناح) ایک ریکروٹمنٹ کے بارے میں بڑا پر زور اعلان کرنا چاہئے۔ چنانچہ گاندھی نے موقف یہ اختیار کیا کہ آپ یہ محسوس نہیں کر سکتے کہ ہر ایک ہوم رول لیگ ایک مضبوط اور مستحکم ریکروٹمنٹ ایجنسی بن جائے اور ساتھ ہی دستوری جنگ برائے حقوق بھی جاری رکھے تو ہمیں یقین ہے کہ کانگریس لیگ سکیم پاس ہو سکتی ہے۔ لہذا آپ (جناح) ریکروٹمنٹ آفس سے رابطہ قائم کریں۔ تو ہر بات آپ پر واضح ہو جائے گی۔“

گاندھی کا یہ خط عجیب و غریب تھا اور اس کا جواب دینے کے لئے جناح کو غم زدہ کر دیا تھا۔ گاندھی نے جب گجرات کے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک ریکروٹنگ کے کام کو جاری رکھا۔ تو اس وقت انہیں جناح کی ریکروٹنگ کے بارے ذہنی حیثیت و کیفیت کی تعریف کرنی پڑی۔

گاندھی نے کہا کہ جب ہی میں نے اپنا کام شروع کیا میری آنکھیں کھل گئیں، اور میری خوش فہمی کو سخت دھچکا لگا۔ ہم جہاں بھی گئے ہم نے اجلاس منعقد کئے۔ لوگوں نے شرکت کی لیکن ایک یا دو سے زیادہ افراد نے ریکروٹمنٹ کے لئے اپنے آپ کو پیش نہ کیا۔ اور لوگوں نے ہم سے یہ پوچھا کہ آپ (گاندھی) اہمسا کے علمبردار ہیں۔ تو پھر ہمیں ہتھیار اٹھانے کے لئے کیوں کہتے ہیں۔ حکومت نے کون سا ہم سے بھلا کیا ہے کہ ہم اس کے ساتھ تعاون کریں۔ اور اسی طرح کے اور سوالات ہم سے پوچھے گئے۔

(Jinnah of Pakistan

By Stanley Wolpert.)

گاندھی نے قدم قدم پر حضرت قائد اعظمؒ کی معاملہ فہمی، سیاسی بصیرت اور قانونی اور دستوری قابلیت و صلاحیت کو محسوس کیا، مگر دل سے کبھی تسلیم نہ کیا۔ مجبوری کے عالم میں زبان سے خود بھی اقرار کیا۔ لیکن اندر سے ہندو ذہنیت کا مظاہرہ ضرور کرتے رہے۔

”اوتار جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کی طرف سے ”پورنا سواراج“ کا دن منانے کا اعلان کیا گیا۔ جس میں یہ قرارداد پیش کی گئی۔ ”ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان برطانیہ سے اپنے تعلقات ختم کر لے گا اور ”پورنا سواراج“ یا مکمل آزادی حاصل کر لے گا“ یہ قرارداد پرے ہندوستان میں پڑھ کر سنا دی گئی۔ جناح اپنے پروقار اور بلند بالا، پرسکوت گھر ملا بارہل سے ہر ایک لمحے کا مشاہدہ کر رہے تھے۔

جناح نے گاندھی پر الزام لگایا کہ انہوں (گاندھی) نے اچانک ایک سیاسی بیجان پیدا اور برپا کر دیا ہے۔ جسے جناح نے عوامی سطح پر کانگریس کا نیا پروگرام تصور کیا۔ سپر نے جناح کو ۱۵ جنوری ۱۹۳۰ء میں خط لکھا۔ ”کہ میں نے آج آپ کانٹروپریس میں پڑھا۔ میں مکمل طور پر آپ سے اتفاق کرتا ہوں۔ کہ کانگریس پاگل ہو گئی ہے۔ اور ان کا پاگل پن سارے ہندوستان کو تباہی و عذاب سے ہمکنار کر دے گا۔“

(Jinnah of Pakistan

By Stanley Wolpert. P113-114

شینلے والبرٹ نے اپنی اس مذکورہ بالا کتاب میں حضرت قائد اعظمؒ کے بارے میں بے لاگ تاثرات بیان کئے ہیں۔ اور بلا شک و شبہ حضرت قائد اعظمؒ کو گاندھی کے مقابلے میں ایک عظیم المرتبت، قابل صد احترام سیاست دان ثابت کیا ہے۔ بے شمار ایسے واقعات ہیں۔ جو اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں تمام کا ذکر طوالت موضوع کا باعث بنے گا۔ شینلے والبرٹ ایک امریکن پروفیسر ہیں۔ جنہوں نے مذکورہ بالا کتاب بڑی محنت اور خاصی تحقیقی و تفحص سے تحریر کی ہے۔ اور اپنے ذاتی تاثرات و تصورات پیش کئے ہیں۔ انہوں نے حضرت قائد اعظمؒ کو اسلامیان ہند کا نجات دہندہ قرار دیا ہے اور گاندھی کو اہمسا اور عدم تشدد کا گرو، جس کا ظاہر اور باطن باہم دست و گریبان ہے۔

جناب میاں بشیر احمد تحریر فرماتے ہیں۔

”جس طرح انا ترک نے ترکیہ کو سنبھال لیا اسی طرح قائد اعظمؒ نے ہندوستان کے دس کروڑ مسلمانوں کے لئے آزادی کی راہ کھول دی، ہر ملک کے حالات جدا اور ہر رہنما کا کام بھی جدا لگانہ نوعیت کا ہوتا ہے۔ قائد اعظمؒ نے جو کام کیا وہ اپنی جگہ لازوال تھا اور اس کے اثرات مدتوں تک اسلامی دنیا میں محسوس ہوتے رہیں گے۔

ہندوستان کے مسلمان مفلوک الحال تھے۔ غیر منظم تھے۔ غیر مسلح تھے اور مایوس تھے۔ انہیں دو ایسی قوموں سے واسطہ پڑا تھا جو سیاسی اور اقتصادی طور پر ان سے زیادہ ترقی یافتہ تھیں۔ خود مسلمانوں کے ہاں بے حد انتشار تھا۔ بہت سے بددیانت اور خود غرض لوگ بھی تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے سامنے کوئی نصب العین نہ تھا اور اس تاریکی میں ان کو غلامی سے نکل بھاگنے کی کوئی راہ نہ سوجھتی تھی۔ اقبالؒ نے ان کو اس نصب العین کی جھلک دکھائی اور قائد اعظمؒ آزادی کے کٹھن سفر میں ان کے عملی رہنما بن گئے۔

• آج سے پچاس برس ہوئے کسی کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔ خود محمد علی جناح کو کبھی اس بات کا یقین نہ ہو سکا کہ ایک دن وہ ایک نئی اسلامی مملکت کے بانی مبنی ہونے والے ہیں۔ کس طرح حالات نے ان کو قوم کار بہر بنا دیا۔ یہ کتنی دلچسپی داستان ہے۔ پہلے برسوں وہ دو مختلف قوموں کو ایک قوم بنانے کے درپے رہے، باوجود سینکڑوں ناکامیوں کے وہ اس اتحاد کا نعرہ بلند کرتے رہے۔ لیکن چالیس برس کے ذاتی تجربات نے ان کو یقین دلایا کہ آزادی کی اگر کوئی راہ ہے تو وہ یہی ہے کہ یہ دو ہمسایہ قومیں اپنی اپنی جگہ مکمل طور پر آزاد ہو جائیں۔ غیروں نے اسے ایک ناقابل عمل منصوبہ سمجھا، رقیبوں نے مذاق اڑایا، مخالفین نے برا بھلا کہا، اپنوں کے پاؤں لڑکھڑا گئے۔ لیکن وہ محمد علی جناح نہ ہوتا جو شک و شبہ میں پھنس جاتا یا مشکلات سے گھبرا جاتا۔

قدرت کیسے بعض دفعہ صرف ایک شخص کے ذریعے سے کروڑوں انسانوں کی قسمت کا فیصلہ کرتی ہے ایک وہ زمانہ تھا کہ پاکستان صرف ایک عملی آدمی کے دماغ کا وہم تھا اور آج آٹھ روڑ لوگوں کی روزمرہ کی زندگی اس شاندار سانچے میں ڈھل رہی ہے۔

کہا گیا ہے کہ پاکستان کی تشکیل ایک معجزے سے کم نہیں، ایسی بات وہ لوگ کہتے ہیں۔ جو بھول جاتے ہیں کہ حقیقی زندگی خود معجزات کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ اور خوددار انسان کے ہاتھوں ہمیشہ غیر معمولی کام سرزد ہوتے ہیں۔ جس قدر ہم مسلمانوں کی حالت ”ناگفتہ بہ“ معلوم ہوئی تھی اسی قدر حیرت انگیز کامیابی ہمیں اپنے عظیم المرتبت رہنما کی ہمت اور خدا کی بے پایاں عنایت سے نصیب ہوئی۔ اب ہمیں اپنے آپ کو اس خوش قسمتی کے شایان ثابت کرنا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت ہم خطروں سے گھرے ہوئے ہیں، دوسروں کے رشک حسد اور حرص و ہوا کا سامنا بھی ہے اور بعض اپنوں کی نادانی سے بھی واسطہ ہے لیکن کیا ہم اپنے مفکر اعظم کے اس قول کو بھول گئے کہ

ع اگر خواہی حیات اندر خطرہ

یہ خطرات ثبوت ہیں اس بات کا کہ ہمارے پاس ایک نایاب گوہر ہے جس کی محافظت ہمارا دل خوش کن فرض ہے اور جس کی آب و تاب روز و شب اسی نسبت سے بڑھے گی جس نسبت سے ہماری ہمت اور قربانی اور خود اعتمادی دنیا کو ہماری زندگی کی شہادت پیش کریں گی۔

(ماہ نو، قائد اعظم، نمبر دسمبر ۱۹۵۰ء)

مضمون: اسلامی دنیا کے دورِ اہم۔ تحریر: ہزیکسیلیسی میاں بشیر احمد

(صفحہ نمبر ۲۰، ۲۱)

بک ناک، لاہور نے ایک کتاب چھاپی ہے، جس کا نام ہے، Jinnah Gandhi Talks جس کا دیباچہ نواب زادہ لیاقت علی خان، سابق وزیر اعظم پاکستان نے تحریر کیا ہے۔ اس کتاب میں حضرت قائد اعظمؒ اور گاندھی کی باہمی خط و کتابت کا ذکر کیا گیا ہے۔ گاندھی نے ایک خط حضرت قائد اعظمؒ کو لکھا جو ذیل میں درج ہے۔

”دلکش“۔ پیچ گئی

۱۹۴۴ - ۷ - ۱۷

جناح بھائی

ایک وقت تھا کہ جب میں نے آپ کو اپنی مادری زبان میں بولنے کے لئے اصرار کیا تھا۔ آج میں آپ کو اسی زبان میں خط لکھنے کی جرات کر رہا ہوں۔ جب میں جیل میں تھا تو آپ سے ملاقات کے

لئے آپ کو دعوت دی تھی۔ چنانچہ میں نے قید میں رہنے تک آپ کو کوئی خط نہیں بھیجا۔ ہم ایک دوسرے سے جب آپ چاہیں گے ملاقات کر سکتے ہیں مجھے آپ اسلام کا دشمن اور نہ ہی ہندوستان کے مسلمانوں کا دشمن تصور کریں۔ میں اسلام کا دوست اور اس ملک کے مسلمانوں کا دوست ہوں۔ میں صرف آپ ہی کا خادم نہیں ہوں بلکہ تمام دنیا کا خادم ہوں۔ مجھے مایوس نہ کیجئے گا۔

میں اس خط کے ساتھ اس خط کا اردو ترجمہ بھی روانہ کر رہا ہوں۔

آپ کا بھائی
گاندھی

اس خط کا جواب حضرت قائد اعظمؒ نے ۲۳ جولائی ۱۹۴۴ء کو دیا جو ذیل میں درج ہے۔

ایچ بی ”کونیز الزبتھ“
سری نگر کشمیر

۲۳ جولائی ۱۹۴۴ء

ڈیر مسٹر گاندھی

میں نے آپ کا خط مورخہ ۱۷ جولائی یہاں پہ ۲۲ جولائی کو وصول کیا، میں اس کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔

میں آپ کو اپنے گھر واقع بمبئی میں ملوں گا جب آپ واپس آئیں گے جب کہ آپ اگست کے وسط میں واپس آئیں گے۔ اس وقت تک مجھے امید ہے کہ آپ صحت و تندرستی سے ہمکنار ہو چکے ہوں گے۔ اور بمبئی واپس آئیں گے۔ میں اس وقت تک کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھتا جب تک ہم آپس میں ملاقات نہیں کر لیتے۔

پریس میں آپ کی صحت کی ترقی پڑھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے، اور مجھے امید ہے کہ آپ بہت جلد ٹھیک ٹھاک ہو جائیں گے۔

آپ کا مخلص
ایم اے جناح

“Jinnah Gandhi Talks”

P. 29-30

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ حضرت قائد اعظمؒ نے کیا جواب دیا اور گاندھی نے کیا لکھا۔ کیا

گاندھی نے زندگی کے کسی موڑ پر بھی اسلام اور اسلامیان ہند کے ساتھ ہمدردی، وفاداری یا خیراندیش ہونے کا ثبوت فراہم کیا۔ یہ ان کے ہندو ذہن کی عکاسی ہے کہ مہاتما کے دل میں کچھ اور ہوتا ہے اور زبان پر کچھ اور۔ حضرت قائد اعظمؒ کا ہی کمال حسن تدبیر اور سلیقہ سیاست و قیادت تھا کہ وہ مہاتمائیت کا توڑ پیش کرتے رہے اور اسلامیان ہند کے لئے آزادی و خود مختاری کے لئے راہیں کھولتے رہے۔ انہیں کس قدر زہریلے کانٹے اپنے راستے سے چٹنے پڑے ہوں گے۔

خوش قسمت تھے وہ صف اول کے قائدین جنہیں حضرت قائد اعظمؒ کی ولولہ انگیز قیادت میں پاکستان کی تخلیق کا فریضہ انجام دینے کا شرف نصیب ہوا۔ خوش نصیب تھے وہ طلباء جنہیں حضرت قائد اعظمؒ کی روح پرور شخصیت کی نگاہ کرم نصیب تھی۔ خوش بخت تھے وہ مزدور، کسان، ملازم اور کاروباری جنہوں نے اپنی آنکھوں سے انہیں دیکھا اور ان کے حکم پر قربان ہو جانے کے لئے ہمہ وقت مستعد اور تیار تھے، کتنا قیمتی تھا وہ وقت جو ان کی مٹھی میں تھا۔ کتنا پیش قیمت تھا وہ لمحہ جو ان کی مرضی سے گزرتا تھا۔ کتنی قابل قدر تھی وہ فضا جس میں وہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ ایسا انسان، جس نے انسانوں کو زندہ رہنا سکھایا۔ جس نے ستاروں کی چمک مستعار نہ لی بلکہ اپنی زمین کے ذرات کو خود چمکنا سکھایا۔ ایسا انسان جس نے زندگی کے اسرار و رموز اپنی مثال پیش کر کے واضح کر دیئے تھے۔ ایسے انسان، انسانی تاریخ میں کم کم پیدا ہوتے ہیں۔ ایسے انسان پروردگار عالم کی بہت بڑی نعمت اور کرم نوازی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ اور ایسی کرم نوازی خدا تعالیٰ ہر وقت نہیں فرمایا کرتے۔ ابھی وقت ہے کہ اپنے عظیم قائد کی قدر کی جائے۔

یا مذاق دید کی تہمت نہ لیتے اے جگر

یا سراپا دل مجسم آنکھ بن کر دیکھتے

کانگریس کی طرف سے ہندوستان کی ضمنی قوموں کو بڑھالوا کے ضمن میں ”دشمن کا نیا حربہ“ کے عنوان سے جناب رئیس احمد جعفری نے اپنی مرتبہ کتاب ”خطبات قائد اعظمؒ“ میں حضرت قائد اعظمؒ کی ایک تقریر کو درج کیا ہے جو انہوں نے جالندھر میں آل انڈیا مسلم سٹوڈنٹس کے اجتماع کو ۱۵ نومبر ۱۹۴۲ء میں خطاب کرتے ہوئے فرمائی تھی۔

”آپ ہندوستان کے مسلمان طلباء کی اس طرح تنظیم کیجئے کہ وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے ایک نقطہ پر جمع ہو جائیں۔ اور ملت اسلامیہ کی معاشری، اقتصادی ترقی و ارتقاء کے لئے تعمیری لائحہ عمل ترتیب دیں۔ ثقافت اسلامی اور تعلیمات محمدیؐ کا احیاء کریں اور ہندوستان کے مختلف اقوام و مملکتوں کے درمیان بھائی چارہ اور خیر سگالی کے احساسات کو ترقی دیں۔ پھر آپ کا یہ بھی فرض ہونا چاہئے۔ کہ ہندوستان، ممالک اسلامیہ میں اور دیگر اقظاع عالم کے طالب علموں میں باہمی

رابطہ و تعاون پیدا کریں اور اس کو وسیع تر کرتے جائیں۔

میں وفاق مسلم طلباء پنجاب کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انہوں نے مارچ ۱۹۴۱ء سے اب تک بڑی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انہوں نے ضلع ضلع مسلم لیگ کا پیام اور لائحہ عمل پیش کیا ہے۔

کل ہند کانگریس کمیٹی نے الہ آباد میں نہ صرف مسٹر راج گوپال اچاری کی تجویز کو جو ہماری تجویز سے مختلف تھی ایک بڑی اکثریت سے مسترد کر دیا بلکہ ایک نئی قرارداد کو اتنی ہی بڑی اکثریت سے منظور کیا۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ مسئلہ پاکستان ”تقسیم اکھنڈ بھارت“ سے کانگریس کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتی۔ وہ مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان پر غور کرنے کے لئے بھی تیار نہیں ہے۔ اس لئے کانگریس نے مفاہمت کا دروازہ بھی بند کر لیا ہے۔

اس کے بعد مسٹر گاندھی پر ایک غیر معمولی نظریہ کا القاء ہوا اور وہ یہ تھا کہ برطانوی حکومت ہندوستان چھوڑ دے۔ اگر انگریز کل ہی ایسا کریں تو مجھے بڑی مسرت ہوگی۔ پھر ہم ان سے بخوبی سمجھ لیں گے۔ (فلک شگاف نعرے)

اب مسٹر گاندھی یہ کہنے لگے ہیں کہ تاوقتیکہ انگریز ہندوستان سے چلے نہ جائیں ہندو مسلم سمجھوتہ کا کوئی سوال ہی نہیں اٹھایا جاسکتا حالانکہ یہ ان کا بنیادی اصول اور ایقان تھا اور جس کو مسٹر گاندھی نے بار بار دہرایا ہے کہ ہندو مسلم سمجھوتے کے بغیر ہندوستان کو آزادی اور خود مختاری نہیں مل سکتی۔

یہ ان شرائط اولین میں سے ایک ہے جو آزادی ہند کے لئے معین کی گئی تھیں، لیکن اسے ایک ہی رات میں دریا برد کر دیا گیا۔ برطانوی حکومت کو ہمارے احتجاج کے بغیر تنبیہ کی گئی ہے کہ وہ ہندوستان کو چھوڑ دے۔ یہ دغاً اور بیک وقت کیونکر ہوا۔ مسٹر گاندھی ادھر ابھی تو حکومت کو کچھ دھمکی اور کچھ گفت و شنید میں لگائے ہوئے تھے اور ایک مرتبہ تو انہوں نے ٹوٹے بھی بہائے تھے۔

جب یہ سارے حربے ناکام ہو چکے تو انہیں انگریزوں پر اس قدر غصہ آیا کہ انہیں ہندوستان سے نکل جانے کو کہہ دیا۔ کیوں؟ وجہ ظاہر ہے۔ ان کا مقصد وہ نہیں ہوتا جو وہ کہتے ہیں۔ اور جو ان کا مقصد ہوتا ہے وہ کہتے نہیں (نعرہ تحسین)۔

حکومت نے ایک ناقابل فہم موقف اختیار کر رکھا ہے۔ برطانوی کہتے ہیں کہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟ کانگریس کے بغیر ہم کس طرح عارضی حکومت ترتیب دے سکتے ہیں۔

(خطبات قائد اعظم)۔ مرتبہ رئیس احمد جعفری۔ صفحہ نمبر ۳۷۲، ۳۷۳

یہ بالکل درست ہے کہ گاندھی نے ہر موقع اور ہر قدم پر پاکستان کی تخلیق اور قائد اعظمؒ کی کوششوں کا راہ روکا۔ انہوں نے کیا کیا حربے، کیا کیا منافقتوں کے پہاڑ نہ کھڑے کئے۔ مگر اس کے باوصف، جب گاندھی کو قتل کر دیا گیا، تو حضرت قائد اعظمؒ نے درج ذیل الفاظ میں ان کی موت پر اظہار افسوس کیا۔

”مجھے یہ معلوم کر کے از حد صدمہ ہوا کہ گاندھی جی پر بزدلانہ حملہ کیا گیا۔ جس سے ان کی موت واقع ہو گئی۔ موت کے بعد مرنے والوں سے کوئی جھگڑا نہیں رہتا۔“

ہمارے اور ان کے درمیان چاہے کیسے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں لیکن اس میں شک نہیں کہ وہ اپنے ملک کے بہت بڑے آدمی تھے اور ہندوؤں کے بزرگ ترین راہنما تھے۔ اور دنیا کے سب امن پسند طبقے ان کی عزت و تکریم کرتے تھے۔ ان کی موت ایسے وقت واقع ہوئی ہے جب ہندوستان اور پاکستان کو آزادی مل گئی تھی اور ان کے ملک پر بڑی آزمائش کا وقت تھا۔ ان کی حسرت ناک موت سے جو خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ اسے پر کرنا مشکل بلکہ ناممکن ہے۔ میں اس حادثہ میں ہندوؤں کی عظیم قوم سے گہری ہمدردی ظاہر کرتا ہوں۔“

(خطبات قائد اعظمؒ۔ مرتبہ رئیس احمد جعفری۔ صفحہ نمبر ۵۴۵)

خدا تعالیٰ نے حضرت قائد اعظمؒ کو بے پناہ انسانی اوصاف سے مزین فرمایا تھا۔ وہ ایک اعلیٰ پائے کے وکیل بھی تھے۔ بلند ترین مرتبے کے سیاست دان بھی تھے، ایک عظیم قائد، قوم کے نجات دہندہ بے مثال رہبر، مرد مومن، کامل ترین انسان اور سیاسی مفکر بھی تھے۔ شمع رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کے پروانوں میں سے تھے، یہی سب تھا کہ ان کی نظر اور ان کا قلب منور تھا۔ مگر افسوس یہ ہے کہ ہماری قوم نے اپنے قائد اعظمؒ کو نہ سمجھا اور نہ سمجھنے کی کوشش کی، ان کے کارہائے نمایاں کی جتنی تبلیغ و تعلیم عام کرنے کی ضرورت تھی، اس کی طرف قطعاً توجہ ہی نہیں دی گئی۔ جب سے پاکستان معرض وجود میں آیا ہے۔ ہماری حکومتیں، ہمارے قومی دن تو خوب خوب مناتی ہیں۔ بڑا چرچا ہوتا ہے، لیکن حضرت قائد اعظمؒ اور تحریک پاکستان کے ضمن میں جو ٹھوس اور موثر اقدامات کئے جانے چاہئیں تھے وہ نہ ہو پائے، وہ جذبہ، وہ ولولہ، وہ ذوق و شوق جو قیام پاکستان کے وقت موجود تھا، اسے پس پشت ڈال دیا گیا، جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پاکستان زندگی کے ہر پہلو سے اور ہر میدان میں عدم استحکام کا شکار ہو کر رہ گیا، پاکستانی قوم کے ہر فرد نے انفرادی ترقی اور خوشحالی کی طرف تو توجہ ضرور دی لیکن مجموعی اور قومی لحاظ سے سارے پاکستان کی بہتری اور سالمیت کے لئے ذرا بھر عمل پیرا ہونے کی کوشش ہی نہیں کی۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف
جناب پروفیسر محمد منور اپنی تازہ تصنیف ”دیوار برہمن“ میں رقمطراز ہیں۔

مقبول ترین لیڈر

کے ایل گاہا صاحب کی انگریزی تصنیف (Great Men of India) میں قائد اعظمؒ کے ایک جلوس کی تصویر ہے جو ۱۹۱۳ء میں کراچی شہر میں نکالا گیا تھا۔ اس وقت موتی لال کو یہ شہرت اور یہ ناموری حاصل نہ تھی اور جواہر لال نہرو ابھی لڑکے تھے۔ یہ نہرو والا معترضہ جملہ اس لئے در آیا کہ جواہر لال نہرو نے اپریل ۱۹۴۷ء میں لارڈ مونٹ بیٹن کو بتایا تھا۔ کہ مسٹر جناح کو آخر عمر میں کامرانی حاصل ہوئی تھی جو ان کے ظرف سے بڑی تھی۔ ساتھ ہی پنڈت کی زبان ”صدائق ترجمان“ نے یہ بھی فرمایا کہ ہاں جناح ایک کامیاب وکیل تھے۔ مگر کچھ ایسے بھی کامیاب نہ تھے۔ اور مونٹ بیٹن نے نہرو کی اس رائے کو کھری اور صاف بات قرار دے دیا۔ یہ امر کیمبل جاسن کی کتاب Mission With Mountbatten میں مذکور ہے۔

حالانکہ حقائق (جیسا کہ اوپر درج کیا گیا ہے) یہ بتاتے ہیں کہ قائد اعظمؒ ۱۹۱۳ء میں بر عظیم کے مشہور ترین اور ہر دلعزیز لوگوں میں تھے۔ ۱۹۱۳ء میں کانگریس نے انہیں اپنا ڈیپٹی بنا کر لندن بھیجا تھا تاکہ وہ پارلیمنٹ میں ہندوستانیوں کا کیس پیش کریں۔“

گاندھی کا تعارف..... قائد اعظم کا وسیلہ

جب گاندھی وارد ہند ہوئے تو قائد اعظمؒ کا ہر طرف طوطی بول رہا تھا۔ چنانچہ گاندھی کو اہل بمبئی کے یہاں پر زور انداز میں متعارف کرانے کے لئے جو دو جلسے کئے گئے۔ ان میں سے دوسرے جلسے کی صدارت (جسے گجرات سبھانے منعقد کیا تھا) کے لئے قائد اعظمؒ سے خصوصی درخواست کی گئی تھی۔ یہ دوسرا جلسہ پہلے کی بہ نسبت زیادہ اہم اور زیادہ بڑا تھا۔ اس امر کا خود گاندھی نے اپنی ۱۹۳۸ء والی خط و کتابت میں بھی ذکر کیا ہے۔ جو انہوں نے قائد اعظمؒ سے کی۔ انہوں نے ایک خط میں لکھا کہ ۱۹۱۵ء میں جب کہ میں جنوبی افریقہ سے آیا تھا تو ہر زبان پر ایک قوم پرست لیڈر کی حیثیت سے آپ کا ذکر تھا۔ میں آپ کو وہی قوم پرست جناح دیکھنا چاہتا ہوں وغیرہ۔

گاندھی ہند میں آتے ہی کانگریس کی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے مگر اس کے باوجود حال یہ تھا کہ ۱۹۱۳ء کے مشہور و معروف لکھنؤ سیشن میں انہیں سبجیکٹس کمیٹی کا بھی ممبران کی کوشش کے باوجود منتخب نہ کیا گیا۔ اور قائد اعظمؒ کا حال یہ تھا کہ انہوں نے اپنے اثر و رسوخ، خوبی بیان اور حسن دلیل سے کانگریس سے وہ جداگانہ طریق انتخاب کا اصول منوالیا جو منٹو مارلے، اصلاحات کے نام سے ۱۹۰۹ء میں بصورت ضابطہ تجویز کیا گیا تھا۔ یہی تھا وہ دور جب لوگ انہیں عزت اور پیار سے ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہتے تھے۔ یہ خطاب درحقیقت انہیں مسٹر گوگلے نے دیا تھا۔ گاندھی کو گوگلے کا قرب میسر نہ آ سکا، اس لئے کہ گاندھی کے وارد ہند ہونے کے چند ہفتے بعد ہی گوگلے کا انتقال ہو گیا۔“

(دیوار برہمن - مصنفہ: پروفیسر محمد منور، صفحہ نمبر ۸۸، ۸۹)

اسی مذکورہ بالا کتاب میں آگے چل کر پروفیسر صاحب مزید تحریر کرتے ہیں۔

مسٹر گاندھی - سراپا ہندو

اصل میں ایک گاندھی باہر کا گاندھی تھا اور ایک گاندھی اندر کا گاندھی تھا۔ اندر کا گاندھی بڑا پکا تھا۔ وہ سراپا ہندو تھا۔ اس کے اپنے بقول اس کا رواں رواں ہندو تھا۔ اندر کا گاندھی ہندو تسلط کے لئے مضطرب تھا۔ باہر کا گاندھی ہندو مسلم اتحاد کا مظہر بنتا تھا۔ اندر کا گاندھی اچھوتوں کو دائماً محروم رکھنا چاہتا تھا مگر باہر کا گاندھی کہتا تھا کہ میں چھوت چھات کو نہیں مانتا۔ مجھے اس تصور ہی سے گھن آتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کسی غلط روایت نے ہندو دھرم میں چھوت چھات کو رواج دیا ہے۔ میں ایسی ہر مشق کو ہندو دھرم کی روح کے خلاف جانتا ہوں۔ یہ باہر کا گاندھی ہے مگر اندر کا گاندھی کبھی کبھی باہر بھی آ جاتا ہے اور راز کی بات بتا جاتا ہے۔ لہذا گاندھی کا اپنا عقیدہ یہ تھا کہ وہ تنازع کے قائل تھے۔ ویدوں اور شاستروں کو مانتے تھے۔ مورتی پوجا کے بھی منکر نہیں تھے۔ ذات پات کے قائل تھے۔ ذاتوں کے درجات کے مطابق جو طبقہ انسانی وسعتی میں بنادئے گئے ہیں انہیں مانتے تھے اور اس کے باوصف کہتے تھے کہ میں چھوت چھات کا نسل نہیں۔ کیا گاندھی یہ بات نہیں سمجھتے تھے کہ ذاتوں کے پیدا کردہ طبقات ہی نے ان سات روز افراد کو اچھوت بنا کر رکھ دیا ہے۔“

(دیوار برہمن - مصنفہ: پروفیسر محمد منور - صفحہ نمبر ۹۰)

”قائد اعظمؒ اور مسٹر گاندھی - کردار میں بعد المشرقین

گاندھی کے ظاہر و باطن میں کس قدر فاصلہ تھا، وہ خود گاندھی بھگت مونٹ بیٹن کی زبانی بار

بار بیان ہوا۔ سروجنی نائیڈو کی زبانی انہوں نے بتایا کہ گاندھی ریل کے جس ڈبے میں سفر کرتے ہیں۔ اس کو جرٹومہ کش دواؤں سے دھلایا جاتا ہے۔ ان کے ہمراہ سفر کرنے والوں کو منتخب کیا جاتا ہے۔ انہیں مناسب لباس میا کیا جاتا ہے اور اس طرح جب وہ بھنگیوں کے محلے میں جا کر رہتے ہیں تو جہاں رہنا ہوتا ہے۔ اس جگہ کو بھی بخوبی صاف کیا جاتا ہے۔ جن لوگوں کو ان کے ارد گرد کے مکانوں میں رہنا ہوتا ہے۔ انہیں منتخب کیا جاتا ہے۔ انہیں خاص قسم کا لباس دیا جاتا ہے وغیرہ۔ یہ کچھ بتا چکنے کے بعد سروجنی نائیڈو نے کہا یورایکسی لیننسی آپ کو کیا معلوم کہ گاندھی جی کو غریب دکھانے کے لئے کانگریس کیا کچھ خرچ کرتی ہے۔ اور اس کے مقابل قائد اعظمؒ تھے کہ شملے میں کانفرنس میں شرکت کرنا تھی اور لوئر بازار میں سے رکشا پر گزرنا تھا، سفید ٹوپ گھٹنوں پر دھرا تھا۔ روانہ ہونے لگے تو کسی درد مند نے کان میں کہا حضور ٹوپ نیچے نشست پر پاؤں کی جانب رکھ دیں تاکہ آپ کے عقیدت مند، سادہ دل مسلمان اسے نہ دیکھ سکیں۔ ممکن ہے کہ اپنے قائد اعظمؒ کو انگریزی ٹوپ کے ساتھ دیکھیں تو ان کی دل شکنی ہو۔ اس پر قائد اعظمؒ نے فرمایا کیا تم نے مجھے گاندھی سمجھا ہے۔ پہلے میں نے یہ ٹوپ گھٹنے پر رکھا ہوا تھا، اب سر پر رکھ کر جاؤں گا۔ یہ کہا اور ٹوپ سر پر رکھ لیا۔ مونٹ بیٹن ہی کیا ہر حریف کو یہ اعتراف کرنا پڑتا رہا کہ قائد اعظمؒ بے مثال امانت اور دیانت اور استقامت کے مالک تھے۔ خود گاندھی، ان کی خدمت گار، ان کی نسلانی بیساکھیاں اور بکریاں (جو پھل کھاتی تھیں) وغیرہ سب لوگ سرمایہ داروں کی سخاوت پر پلٹے تھے۔ قوم کا کھاتے تھے۔ مگر اس کے برعکس قائد اعظمؒ نے کبھی قوم سے کچھ نہ لیا۔ لاکھوں روپے قوم کو زندگی میں بھی دیئے اور لاکھوں روپے کی وصیتیں کر گئے جن سے کئی تعلیمی اور طبی ادارے آج تک مستفید ہو رہے ہیں۔ تفصیل میں جاؤں تو بات لمبی ہو جائے گی۔

(دیوار برہمن۔ مصنفہ پروفیسر محمد منور صفحہ نمبر ۱۰۸، ۱۰۹)

• طلوع اسلام سرٹرسٹ کی شائع کردہ کتاب ”تحریک پاکستان اور پرویز“ میں بحضور حضرت قائد اعظمؒ تحریر کیا گیا ہے۔ ”حریت نواز۔ ذرا تصور میں لائیے ایسے وقت کو کہ ایک وحشت انگیز ہولناک بیابان میں راہ گم کردہ مسافروں کا ایک بکھرا ہوا قافلہ نشان منزل سے مایوس ہو کر ضعف عزیمت سے پاشکتہ بیٹھ چکا ہو۔ ایک در ماندہ راہرو کی صدائے دردناک جو آواز رحیل کا کام دے رہی تھی۔ فطرت کے اہل قوانین کے تحت خاموش ہو چکی ہو، شام کو بھیانک سناٹا، سر پر منڈلانے والی شب تیرہ و تار کی ہیبت انگیزیوں کا پیام جا نکاہ دے رہا ہو۔ غاروں میں چھپے ہوئے درندوں کے پاؤں کی آہٹ موت کو قریب تر لاتی نظر آرہی ہو۔ درختوں کی اوٹ میں بیٹھے ہوئے رہنوں کی ریشہ دوانیاں دامن صحرا پر پھیلتے ہوئے اندھیروں کے ساتھ بڑھتی چلی آرہی ہوں۔ وہ لوگ جن کی

قیادت و سیادت پر بھروسہ تھا۔ برادران یوسف کی طرح اپنے قافلہ کی گراں بہا متاع دوسروں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کی فکر میں ہوں۔ غرضیکہ ہلاکت یقینی اور تباہی اٹل معلوم ہوتی ہو۔ افراد قافلہ میں سے جن کے دلوں میں اس الم انگیز کیفیت کا احساس ہوا ان کی نگاہیں رہ رہ کر آسمان کی طرف اٹھ رہی ہوں۔ کہ دور، افق امید سے ایک شاہ سوار رواں دواں، امیدوں کی ایک دنیا اپنے ساتھ لئے ان سوختہ سامانوں کی طرف بڑھتا چلا آئے۔ منتشر افراد کارواں کو پھر سے ایک مرکز پر جمع ہونے کی دعوت دے اور اپنوں اور بیگانوں کی تیار کردہ ہلاکت و بربادی کی گھائیوں سے بچاتا ہوا۔ انہیں کسی محفوظ مقام کی طرف لے جانے کی فکر کرے۔

نشان راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے تھے کسی مرد راہ داں کے لئے

قوم کی صحیح راہنمائی کرنے والے ایک ایک کر کے چل بے تھے۔ بزم ملت کی آخری شمع جس کی ضیا پاشیوں سے لاکھوں آنکھیں پر نور تھیں۔ ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کی صبح کو بجھ چکی تھی۔ اس کس مپرسی اور بے کسی کے عالم میں اللہ تعالیٰ نے اس منتشر قافلہ کی شیرازہ بندی کے لئے آپ کی ذات گرامی کو چن لیا۔ اور آپ کی نگہ دور رس نے اس قافلے کو بتایا۔ کہ ان کے گرد و پیش کس کس قسم کی خطرناک گھائیاں موجود ہیں۔ وہ گھائیاں کہ جن میں کہیں ”متحدہ قومیت“ کے دام ہمرنگ زمین میں کبوتر حرم کو پھانسنے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ کہیں کسی منبر سے یہ آواز آرہی تھی کہ قومیتیں مذہب سے نہیں، اوطان سے بنتی ہیں۔ اور یوں اس طائر لاہوتی کے بال و پر کو غبار آلودہ ارض و بوم بنا کر امت رسولؐ کا فتنہ الناس کو جغرافیائی حدود کی آب و گل میں محبوس کیا جا رہا تھا۔ کہیں ”امرہم شوریٰ بینہم“ کی حامل قوم کی نگاہوں میں مخلوط انتخاب کے سراب کو آب حیوان بنا کر دکھایا جا رہا تھا۔ کہیں اس ”اولی الامر منکم“ کی مامور جماعت کے لئے غیر مسلموں کی امامت و قیادت کو عین دین قرار دیا جا رہا تھا۔ کہیں انگریز کے خلاف ”متحدہ محاذ“ کے طلسم سے کفار و مشرکین سے تولی کے جواز کے فتاویٰ شائع ہو رہے تھے۔ ایک طرف ایک مغنی آتش نفس سرود گاہ وار دھاک مستعار لے میں یہ خواب آور گیت گارہا تھا کہ عالم گیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر موجود ہیں۔ اس لئے اسلام کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فوقیت نہیں۔ دوسری طرف کچھ خداوندان مکتب، شاہین بچوں کے لئے اہمسا کی بازو شکن تعلیم کی سکیمیں تیار کر رہے تھے۔ ہندو اپنے ذہن میں ”رام راج“ کے قیام کے منصوبے باندھ رہا تھا۔ اور اس کے لئے انگریز سے ”شریفانہ معاہدہ“ برقرار کر رہا تھا۔ ہندوؤں کے شور و غوغا سے متاثر انگریز بھی مسلمانوں کو بالاتامل ہندو کے ہاتھ میں دے دینے پر آمادہ تھا۔ کہ وہ اپنی پانچ ہزار سالہ غلامی کا

جذبہ انتقام اس کے خون سے ٹھنڈا کرے۔ جو لوگ اغیار کی صفوں میں کھڑے ہو کر ملت اسلامیہ کی نمائندگی کا دعویٰ کر رہے تھے۔ ان میں اتنا بھی سمجھنے کی استطاعت نہ تھی کہ بساط سیاست پر یہ آئینی مہرے کس طرح چلائے جا رہے ہیں۔ ہندو خوش تھا کہ میں نے ۹ کروڑ فرزند ان توحید اچھوتوں کی صف میں ملا دیا۔ انگریز راضی تھا کہ وہ خنجر ہلائی جس کے بے نیام ہونے کے خوف سے کلیجہ صلیب میں ہمیشہ دھڑکن رہتی تھی اسے گنگا کی لہروں میں بہا دیا گیا کہ اس کس مہرے کے عالم اور اس خلفشار و تشقت کے وقت آپ آگے بڑھے اور ہندوؤں اور انگریزوں کے ہر خفیہ منصوبے اور پوشیدہ سازش کو ایک ایک کر کے بے نقاب کر دیا اور یوں ان کے تصورات کی حسین دنیا کو ایک خواب پریشان میں تبدیل کر کے رکھ دیا اور ساری دنیا پر اس حقیقت عظمیٰ کو واضح کر دیا کہ آساں نہیں مٹانا نام و نشان ہمارا

(تحریک پاکستان اور پرویز۔ مرتبہ طلوع اسلام ٹرسٹ صفحہ نمبر ۴۴۶ - ۴۴۸)

پاکستان زندہ باد

قائد اعظمؒ زندہ باد

www.KitaboSunnat.com

Department of Islamic Studies
Punjab University, Lahore

عظم

مؤلف

297 648

م 130 ق



* 2 0 8 3 6 - E U - 6 4 *